حضرت یوسف علیہ السلام

اور

غیر اسلامی نظامِ حکومت کی رکنیت

(از جناب خان بہادر نواب محمد ذکاء اللہ خاں صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر یوپی سابق نائب دیوان ریاست دتیا)

ترجمان القرآن بابت مارچ و اپریل ۱۹۴۳ء میں "رسائل و مسائل" کے عنوان کے تحت کسی صاحب کا استفسار اور مولانا مودودی صاحب کا جواب شائع ہوا ہے۔ ذیل کے سطور میں راقم الحروف کچھ مختصر تنقید مولانا مودودی صاحب کے جواب پر ہدیۂ ناظرین کرتا ہے۔

مستفسر صاحب کا استفسار یہ ہے:-

"قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو تمکن فی الارض عطا فرمایا گیا اور وہ دائرہ حکومت میں ایک ممتاز حیثیت سے شریک ہوگئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آپ ایک رسول تھے اس لیے فریضۂ رسالت کی سرانجام دہی بھی آپ کے لیے ضروری تھی۔ دربارِ فرعون کے مردِ مومن نے اپنی تقریر میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ حضرت یوسف کی نبوت پر قوم فرعون ایمان نہیں لائی تھی اور یہ بھی کہ آپ اپنی وفات تک ڈھیل دیتے رہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ آپ نے اپنی نبوت کو پیش کیا لیکن فرعون اور اس کی قوم اس پر ایمان نہیں لائی اس کے باوجود حضرت یوسف اُس کی حکومت میں شریک کار رہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا ایک برگزیدہ رسول غیر خدائی نظامِ حکومت کا شریک کار کس طرح رہا.........

اوپر کے استفسار کے جواب میں مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں: "بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ دور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے گذرا ہے قریب قریب بالکل تاریکی میں ہے اس لیے قرآن کے اشارات کی تفصیل معلوم کرنا مشکل ہے، تاہم قرآن مجید نے اپنے مجمل اشارات سے اس امر میں شک باقی نہیں رہنے دیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت مصر میں غیر خدائی نظامِ حکومت کے شریک کار کی نہ تھی بلکہ وہی مختار کل تھے اور انہوں نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی ہی اس شرط کے ساتھ تھی کہ کل اختیارات ان کے ہاتھ میں ہوں، اس آیت کو بغور پڑھیے: قال اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم وکذلک مکنا لیوسف فی الارض یتبوأ منہا حیث یشاء۔ خط کشیدہ فقرے صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ مطالبہ کلی اختیارات کا تھا اور ملے بھی کلی اختیارات ہی۔ خزائن الارض کا لفظ دیکھ کر بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ جگہ شاید فنانس ممبری یا ریونیو ممبری کی تھی حالانکہ دراصل اس سے مراد ملک کے جملہ وسائل (Resources) ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا مطالبہ یہ تھا کہ سلطنت مصر کے تمام وسائل میرے اختیار میں دے دیے جائیں اور اس کے نتیجہ میں جو اختیارات انہیں ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری سرزمین مصر ان کی تھی۔"

مستفسر نے جو بات دریافت کی تھی اور جو بات دراصل بحث طلب ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ آیا یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظامِ حکو

کے رکن اور شریک کار بنے یا نہیں۔ اور اگر بنے تو حضرت یوسف علیہ السلام کا ایسا کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز تھا یا نہیں۔ مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ "حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت مصر میں غیر خدائی نظام حکومت کے شریک کار کی نہ تھی"۔ اور تعجب ہے کہ اپنی اس رائے کی تائید میں کلام پاک کی وہی آیت قال اجعلنی الی آخرہ پیش کرتے ہیں جو در اصل اس کے ضد کو ثابت کرتی ہے۔

آیت مذکور کا لفظی ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے الفاظ میں یہ ہے:-

"یوسف نے کہا مجھکو مقرر کر ملک کے خزانوں پر میں نگہبان ہوں خوب جاننے والا۔ اور یوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا اس میں جہاں چاہتا"۔

اب دیکھیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام فرعون مصر سے خواہش کرتے ہیں کہ تو مجھکو اپنے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دے فرعون آپکا مطالبہ منظور کرتا ہے اور آپ فرعون کے محکمہ مال کے افسر مقرر ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ آپ فرعون کے نظام حکومت کے ایک رکن یا شریک کار بن جاتے ہیں۔ مولانا مودودی صاحب اس بدیہی نتیجہ سے بچنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں جبکہ وہ فرماتے ہیں کہ "مطالبہ کلی اختیارات کا تھا اور ملے بھی کلی اختیارات"...... اول تو کلی کا لفظ کلام پاک میں ہے نہیں، یہ لفظ مولانا اپنی طرف سے کلام پاک کی عبارت پر بڑھانا چاہتے ہیں تاکہ کلام پاک مولانا کے ذاتی نظریوں کا تابع ہو جاوے نہ یہ کہ مولانا اپنے ذاتی نظریوں کی اصلاح مفہوم قرآنی کے مطابق کر لیں۔ اسی جیسی ذہنیت کے متعلق غالباً اقبال مرحوم نے کہا تھا "خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں"۔ لیکن اس کلی کے لفظ کے ناجائز اضافہ سے بھی مولانا کے اجتہاد یا نظریہ کی تائید نہیں ہوتی۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کلی اختیارات مال کا مطالبہ کیا تھا اور کلی اختیارات ہی ملے تھے لیکن وہ اختیارات فرعون مصر ہی سے تو مانگے گئے تھے اور فرعون مصر ہی نے تو وہ اختیارات عطا کیے تھے اس لیے باوجود ان کلی مالی اختیارات کے حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت اس وقت کے نظام حکومت میں ایک رکن یا ایک شریک کار سے زائد کی نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح مولانا مودودی صاحب کا یہ فرمانا کہ "حضرت یوسف علیہ السلام کا مطالبہ یہ تھا کہ سلطنت مصر کے تمام وسائل میرے اختیار میں دیدیے جاویں اور اس کے نتیجہ میں جو اختیارات ان کو ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری سرزمین مصر ان کی تھی"۔ بالکل خلاف واقعہ ہے۔ یہ مان بھی لیا جاوے کہ یوسف علیہ السلام نے مال کے جملہ اختیارات کا مطالبہ کیا تھا اور مال کے جملہ اختیارات آپ کو تفویض ہو گئے تھے تاہم سلطنت میں مال کے علاوہ بہت سے دیگر محکمے ہوتے ہیں مثلاً پولیس، فوج، عدالت۔ ان میں سے کسی کا مطالبہ یوسف علیہ السلام کی طرف سے کیا گیا نہ یہ محکمے آپ کے سپرد کیے گئے تو پھر مولانا مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ "جو اختیارات انھیں ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری سرزمین مصر ان کی تھی"۔ بالکل بے بنیاد ہے۔

اس لیے یوسف علیہ السلام کی حیثیت مصر کے خزائن پر متصرف ہونے کے بعد بھی سلطنت کے ایک رکن یا شریک کار کی رہتی ہے جب تک کہ کسی ذریعہ سے یہ ثابت نہ ہو کہ فرعون مصر اپنی سلطنت اور حکومت سے دست بردار ہو گیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کی جگہ مصر کے بادشاہ اور ملک بن گئے تھے سو یہ تاریخ سے ثابت ہے نہ کلام پاک سے بلکہ خود کلام پاک سے بصراحت اس کی تردید ہوتی ہے۔

آیت زیر بحث سے ما قبل یہ آیات ہیں

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي	انھیں میرے پاس لے آؤ کہ میں انھیں اپنے لیے چن لوں
فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ	پھر جب اس (یعنی یوسف علیہ السلام) بات کی کہا بیشک تم ہمارے یہاں معزز معتمد ہو۔

ان ہر دو آیات سے بالکل واضح ہے کہ فرعون مصر نے یوسف علیہ السلام کو اپنی سلطنت کا معزز اور معتمد رکن اور اپنا مشیر خاص بنایا۔ ان آیات میں اس بات کا شائبہ بھی نہیں کہ فرعون مصر اپنی سلطنت یا اپنے اختیارات سے دست بردار ہوگیا۔ نیز ایک مابعد کی آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خزائن مصر پر متصرف ہونے کے عرصہ بعد تک فرعون مصر کی سلطنت قائم تھی اور فرعون مصر کا دین ہی ملک میں جاری تھا کیونکہ جب برادران یوسف دوسری مرتبہ غلہ کی بھرتی کرنے آئے ہیں اور اپنے ساتھ حضرت یوسفؑ کی خواہش کے مطابق حضرت یوسفؑ کے حقیقی بھائی بن یامین کو بھی لائے اور حضرت یوسف نے اپنے بھائی بن یامین کو اپنے پاس رکھا اور بن یامین پر ظاہر بھی کر دیا کہ وہ ان کا حقیقی بھائی ہے مگر اپنے دوسرے بھائیوں پر اس امر کو ظاہر نہیں کیا اور چونکہ حضرت یوسف بن یامین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے اس لیے دوسرے بھائیوں پر اس امر کے ظاہر کیے بغیر کہ بن یامین ان کا بھائی ہے اس کی یہ تدبیر کی کہ جب برادران یوسف کے واسطے ان کا اسباب تیار کر دیا گیا تو بن یامین کے اسباب میں ایک پانی پینے کا پیالہ رکھوا دیا اور جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو موذن یا پکارنے والے نے پکار کر کہا کہ اے قافلہ والو تم البتہ چور ہو۔ برادران یوسف نے اس سے انکار کیا تو پکارنے والے نے کہا کہ کیا سزا ہے اس کی اگر تم نکلے جھوٹے۔ برادران یوسف نے کہا اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں ہاتھ آوے وہی اس کے بدلے میں جاوے۔ ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو۔ اس کے بعد تلاشی لی گئی اور پیالہ بن یامین کے اسباب میں سے برآمد ہوا۔ چنانچہ بن یامین پیالے کے بدلے میں روک لیے گئے۔ اس موقعہ پر ارشاد خداوندی ہے "ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک الا ان یشاء اللہ۔" جس کا لفظی ترجمہ ہے "وہ (یعنی یوسف) ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس بادشاہ کے مگر جو چاہے اللہ۔"

خط کشیدہ عبارت صاف بتاتی ہے کہ مصر کا ملکی قانون اس وقت تک مصر میں جاری تھا اور اس قانون کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بن یامین کو چوری کے الزام میں اپنے بھائیوں سے نہ لے سکتے تھے مگر خداوند عالم نے خود ان کے بھائیوں کے منہ سے کہلوا دیا کہ چوری کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں سے چوری کا مال ہاتھ آوے وہی اس کے بدلے میں جاوے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ کی جو تفسیر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے کی ہے وہ یہ ہے کہ "یعنی بھائیوں کی زبان سے آپ ہی نکلا کہ جس کے پاس سے مال نکلے اس کو غلام بنا لو۔ اس پر پکڑے گئے ورنہ حکومت مصر کا قانون یہ نہ تھا اگر ایسی تدبیر نہ کی جاتی کہ وہ اپنے اقرار میں بندھ جاویں تو ملکی قانون کے مطابق کوئی صورت بن یامین کے روک لینے کی نہ تھی۔"

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ملک مصر کی وزارت پر متمکن ہونے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے تبلیغ کا کام نہیں کیا یا اپنی رسالت کے اعلان سے گریز کیا بر خلاف اس کے صاحب ممدوح نے اس وقت جبکہ آپ جن یا جیل میں تھے اسی وقت وحدانیت کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے ساتھی قیدیوں سے فرماتے ہیں "یصاحبی السجن ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار ما تعبدون من دونہ الا اسماء سمیتموھا انتم و اباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطان ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ۔" اسی طرح وزارت کے عہدہ پر متمکن ہونے کے بعد بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا تبلیغ کا کام ضرور جاری رکھا ہوگا۔ البتہ جو بات ان آیات سے بلاشک و شبہ کے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظام حکومت کے رکن خود اپنی خواہش اور درخواست پر بنے اور حضرت یوسف کے اس حکومت کے رکن بننے کے بعد بھی ملک میں غیر اسلامی نظام حکومت اور غیر اسلامی قانون ہی نافذ رہا اور یوسف علیہ السلام کے اس عمل پر بجائے اس کے کہ خداوند عالم کی طرف سے کوئی سرزنش کی جاوے یوسف علیہ السلام کے اس عمل کو ایک طرح سے سراہا جاتا ہے کیونکہ یوسف علیہ السلام کے اس تمکن فی الارض کو انعام خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے "وکذلک مکنا لیوسف فی الارض یتبوا منھا حیث یشاء۔" جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمان

تو مسلمان انبیا تک کے لیے غیر اسلامی نظام حکومت کا رکن بننا جائز ہے اور جائز ہی نہیں بلکہ بعض صورتوں میں بطور فرض کفایہ کے واجب ہے کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خود خواہش کر کے مصر کے خزائن پر متصرف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ایسا کرنے کو یوسف علیہ السلام اپنے لیے جائز ہی نہیں بلکہ اپنے اوپر واجب خیال فرماتے تھے ورنہ وہ فرعون سے ایسی خواہش کبھی نہ فرماتے اور نہ ایسی خواہش کرتے وقت وہ اپنے حفیظ و علیم ہونے کا اظہار کرتے کیونکہ اگر آپ کے نزدیک ملک مصر کا وزیر بننا آپ پر لازم اور واجب نہیں تھا تو آپ کا اپنے آپ کو حفیظ اور علیم بتانا بیجا مدح سرائی اور خودستائی میں داخل ہوتا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کا حاشیہ جو اس آیت پر مولانا نے لکھا ہے بڑی حد تک میرے خیال کی تائید کرتا ہے چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:۔

"یعنی دولت کی حفاظت بھی پوری کروں گا اور اس کی آمد و خرچ کے ذرائع اور حساب و کتاب سے بھی خوب واقف ہوں۔ یوسف نے خود درخواست کر کے مالیات کا کام اپنے ذمہ لیا تاکہ اس ذریعہ سے عامہ خلائق کو پورا نفع پہنچا سکیں خصوصاً آنے والے خوفناک قحط میں نہایت خوش انتظامی سے مخلوق کی خبر گیری اور حکومت کی مالی حالت کو مضبوط رکھ سکیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمدردی خلائق کے لیے مالیات کے قصوں میں پڑنا شان نبوت کے خلاف نہیں ہے، نیز اگر ایک آدمی نیک نیتی سے یہ سمجھے کہ فلاں منصب کا میں اہل ہوں اور دوسروں سے یہ کام اچھی طرح نہ بن پڑے گا تو مسلمانوں کی خیر طلبی اور نفع رسانی کی غرض سے اس کی خواہش یا درخواست کر سکتا ہے۔ اور اگر حسب ضرورت اپنے بعض خصال حسنہ اور اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کرنا پڑے تو یہ ناجائز مدح سرائی میں داخل نہیں ہے۔"

مولانا عثمانی صاحب کی اوپر کی تفسیر سے بھی ناظرین کرام پر ظاہر ہو گیا ہو گا کہ حضرت یوسف نے خود درخواست کر کے مالیات کا کام اپنے ذمہ لیا تھا وہ مختار کل یا خود مختار حاکم نہیں بن گئے تھے۔ عبدالغفار صاحب چندواڑی جن کا مراسلہ "مسلمان" لاہور مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۴۲ء شائع ہوا ہے اپنے مراسلہ میں فرماتے ہیں کہ "حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک انگریزی عدالتی اور پولیس کی نوکری جائز ہے ونیز مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے بھی بشرط عدم ظلم و معصیت جائز لکھا ہے بلکہ ضرورتاً مقصد اسلامی قرار دیا ہے"۔

علمائے متاخرین میں حکیم الامۃ مولانا مولوی اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مسلمہ طور پر اس پایہ کے فقیہ تھے کہ ہندوستان میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک بھی موجودہ نظام حکومت میں ملازمت کرنا ناجائز نہیں تھا کیونکہ ان کے بعض اہل خلیفہ سرکاری ملازم تھے جیسے مولانا خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری۔

جمعیۃ العلماء ہند جو ہندوستان کے مستند علماء کی سب سے بڑی جماعت ہے اس کے نزدیک بھی موجودہ نظام حکومت کا رکن بننا ناجائز نہیں ہے۔ کیونکہ علماء کی اس محترم جماعت کے علم اور اجازت سے پچھلی کانگریسی حکومتوں کے دور میں بہت سے مسلمان کانگریسی حکومتوں کے ممبر بنے۔ اس لیے جمہور علماء کا مسلک یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام کا رکن بننا اور اس حکومت کے نظام میں حصہ لینا ناجائز نہیں ہے۔ اس اگر حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون کی حکومت کا رکن یا شریک کار بننا درانحالیکہ وہ حکومت اپنے کفر پر قائم تھی ہمارے لیے ایک سند کا کام دے سکتا ہے یا مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور جمہور علماء ہند کا اس باب میں اجتہاد ہمارے لیے قابل اتباع ہے تو مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کے وہ سب فتاوے جو مسلمانوں کو موجودہ نظام حکومت میں کسی حیثیت سے ملازمت کرنے سے روکتے ہیں اور ایسے مسلمانوں کی اس آمدنی کو جو ان ذرائع سے ہوئی ہو حرام بتاتے ہیں مثل حرف باطل کے مٹا دینے کے قابل ہیں۔ برخلاف اس کے حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال اور عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے موجودہ نظام حکومت میں

شریک کار ہونا نہ صرف جائز ہی نہیں ہے بلکہ بطور فرض کفایہ کے واجب ہے جس کی تائید میں علاوہ اوپر کی نقلی دلائل کے کچھ عقلی دلائل بھی پیش کی جاتی ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اگر کسی غیر مسلم نظام حکومت میں مسلمانوں کو کچھ اختیارات حاصل ہیں یا مسلمانوں کو اتنی قدرت ہے کہ اس غیر مسلم حکومت میں وہ کچھ اختیارات حاصل کر سکیں تو ان اختیارات سے بالکل دست بردار ہو جانا یا باوجود قدرت کے اس غیر مسلم حکومت میں اختیارات حاصل نہ کرنا کس طرح خدمت دین یا اسلام ہو سکتا ہے۔ صحیح نقطۂ نظر تو غالباً اس امر کا متقاضی ہوگا کہ اگر مسلمان کفرستان میں یا کسی غیر مسلم حکومت کے تحت رہتے ہیں تو اس کفرستان یا غیر مسلم حکومت کے نظام میں جس قدر اختیارات حاصل کرنے پر بھی مسلمانوں کو قدرت ہو اس قدر اختیارات مسلمان ضرور حاصل کریں کیونکہ جس نسبت سے کسی کفرستان میں مسلمانوں کو اختیارات حاصل ہوں گے اسی نسبت سے کفر کا زور گھٹے گا (یہ میرے ایک مضمون "اسلامی جماعت" اور دیگر سیاسی جماعتوں کے پروگرام کا تقابل مطبوعہ منشور دہلی مورخہ ۴ و ۱۰ جنوری ۱۹۴۳ء کا انتخاب ہے تفصیل کے لیے مضمون ملاحظہ ہو۔

(۲) مسلمان اگر کسی غیر اسلامی نظام حکومت میں بطور محکوم کے رہتے ہیں اور اس نظام حکومت میں ان کا کوئی حصہ، ان کا کوئی دخل، ان کو کوئی اختیار نہیں ہے تو ایسی صورت میں ان کی محکومیت اور غلامی درجہ اتم کو پہنچ جاتی ہے جس نسبت سے مسلمانوں کو اس حکومت میں بذریعہ اس حکومت کی رکنیت کے بطور اس حکومت کے شریک کار ہونے کے اختیارات حاصل ہوتے جاویں گے اسی نسبت سے ان کی محکومیت اور ان کی غلامی میں کمی آتی جاوے گی۔

(۳) مسلمان ایک غیر مسلم نظام حکومت میں بطور محکوم کے رہتے ہیں اس حکومت کی مشینری میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے اس حکومت کی مشینری کا کوئی کل پرزہ ان کے اختیارات اور قبضہ میں نہیں ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ اس ملک میں ایک دوسری قوم بھی بطور محکوم کے رہتی ہے۔ مگر یہ دوسری قوم حکومت کی مشینری میں حصہ دار ہے اور برابر کوشش کرتی ہے کہ اس کا حصہ اور اختیار اس مشینری میں روز بروز بڑھتا جاوے اگر کسی وقت یہ نظام حکومت درہم برہم ہو جاوے تو بظاہر اسباب مسلمانوں کو جو اب تک اس حکومت کی مشینری سے بالکل باہر ہیں اس حکومت کی مشینری پر قبضہ کرنے میں زیادہ سہولیت ہوگی یا اس دوسری قوم کو جو پہلے سے اس حکومت کی مشینری کے کل پرزوں سے واقف ہے اور ان میں سے بہت سوں پر پہلے سے قابض ہے۔

(۴) مسلمان مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کی ہدایت کے مطابق فرض کیجیے کہ موجودہ نظام حکومت سے ہر قسم کا اشتراک عمل ترک کر دیتے ہیں۔ نہ اس کی ملازمت اختیار کرتے ہیں نہ اس کی کسی قسم کی رکنیت قبول کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے اس عدم تعاون سے کوئی ذرہ بھر نقصان بھی اس نظام حکومت کو پہنچتا ہے یا حکومت کی مشینری کے چلنے میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ رکاوٹ بھی پیدا ہوتی ہے؟ ظاہر ہے کہ کچھ نہیں (اگر کوئی صورت ہے کہ جس میں مسلمانوں پر کسی غیر اسلامی حکومت کے ساتھ عدم تعاون کرنا ضروری ہو سکتا ہے تو وہ صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ ایسے عدم تعاون سے اس حکومت کی گاڑی کا چلنا بالکل بند ہو جاوے یا اس کے چلنے میں معتدبہ رکاوٹ پیدا ہو جاوے) برخلاف اس کے مسلمان اس عدم تعاون کی وجہ سے بہت سے ضروری علوم و فنون اور معلومات سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں، مثلاً ریلوے، تار برقی، ریڈیو۔ یہ سب محکمات گورنمنٹ کے قبضہ میں ہیں۔ مسلمان ان محکموں میں ملازمت یا ان میں شریک کار ہونے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اگر مسلمان مثلاً ریلوے میں کام کرنے سے پرہیز کرتے ہیں تو مسلمان بحیثیت ایک قوم اصل ایک تحریک پیروؤں کے ریلوے کے علم و عمل [illegible] سے ناواقف و نابلد رہتے ہیں نہ ہم کو ریلوے لائن ڈالنی آوے گی، نہ ریلوے انجینیرنگ کا کچھ واقفیت ہوگی، نہ لوکو موٹو! [illegible]

انجن بنانا آوے گا، نہ ریلوے کی سڑک اور پل تیار کرنا جانیں گے۔ اسی طرح تار برقی کا محکمہ حکومت کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ اس محکمے میں ملازمت کرنے یا اس کے رکن بننے سے احتراز کرنے کی صورت میں تار برقی کے کام سے بھی بالکل ناواقف رہیں گے۔ یہی حال ریڈیو وغیرہ کا ہے۔ یہی حال ہمارا دیگر محکمات کے متعلق ہوگا۔ برخلاف اس کے ہندوستان کی دیگر اقوام اپنے تعدد کی وجہ سے نہ صرف ان محکمات کے عمل سے واقف ہوں گے بلکہ ان محکمات کے عمال کی حیثیت سے بڑی حد تک ان محکمات پر قابض ہوں گے۔ لہٰذا اگر موجودہ نظام حکومت کسی وقت اپنے مواعید کے مطابق حکومت سے دست کش ہو جاوے یا ہندوستان کی رائے عامہ موجودہ نظام حکومت کو حکومت سے دست بردار ہونے پر مجبور کردے تو کون اس کا زیادہ اہل ہوگا کہ ان محکمات ریلوے، تار، ریڈیو وغیرہ پر قبضہ کر سکے۔ مسلمان جو ان محکموں کے کام سے بالکل ناواقف ہیں یا دیگر اقوام جو یہی نہیں کہ ان محکموں کے کام (Working) سے واقف ہوں گے بلکہ ان محکموں پر اس وقت بڑی حد تک قبضہ بھی پہلے سے کیے ہوئے ہوں گے۔

اوپر کی تقریر سے جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ غیر اسلامی نظام حکومت کا رکن بننا یا اس کے عدالت اور مال کے محکموں میں عہدے قبول کرنا جائز ہی نہیں بلکہ بطور فرض کفایہ کے واجب ہے تو یہ آپ سے آپ طے ہوگیا کہ ایسی عدالتوں میں بطور مدعی یا مدعا علیہ کے جانا جائز ہے مگر مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کا بڑی سختی کے ساتھ اصرار ہے کہ ان عدالتوں میں بحیثیت مستغیث یا مدعی کے جانا حرام ہے۔ اس نظریے کی مکمل تردید میں اپنے مضمون 'اسلامی جماعت اور دیگر سیاسی جماعتوں کے پروگرام کا تقابل' مطبوعہ منشور دہلی مورخہ ۴ و ۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء میں کر چکا ہوں۔ اس وقت اس بحث کے متعلق صرف ایک دو موٹی موٹی باتیں ہدیۂ ناظرین کرنا چاہتا ہوں۔

اگر انگلستان، جرمنی یا امریکہ میں کچھ انگریز، جرمن یا امریکن (American) اسلام قبول کرلیں، جیسا کہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے اور ان مسلمانوں میں سے کسی کا مکان یا زمین کوئی انھیں ملکوں کا غیر مسلم غصب کرلے یا اس مسلمان کی عورت کو کوئی غیر مسلم اغوا کرلے جائے یا ان مسلمانوں میں سے کسی مسلمان عورت کے ساتھ کوئی مسلمان یا غیر مسلم زنا بالجبر کرے یا ان میں سے کسی مسلمان کو کوئی غیر مسلم قتل کردے یا اس قسم کے واقعات مسلمانوں کے ساتھ خود یہاں ہندوستان میں پیش آویں جیسا کہ آتے رہتے ہیں تو کیا مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کے نزدیک ان مظالم کی بابت ملکی عدالتوں کی طرف رجوع کرنا اور ان میں استغاثہ دائر کرنا ناجائز اور حرام ہے؟ اگر ہے تو کیا یہ نظریہ دین میں بجائے عسر پیدا کرنے کا مترادف نہیں ہے؟ اگرچہ اسلام دین میں یسر پیدا کرنا چاہتا ہے نہ کہ عسر۔ ان اللّٰہ یرید بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ وما جعل علیکم فی الدین من حرج (الحج - ۱۱) کیا اسلام جیسا مذہب اپنے پیروؤں کو ایسی تکلیف مالا یطاق دے سکتا ہے؟ کیا انگلستان یا جرمنی کے مسلمانوں پر شریعت اسلامیہ کی رو سے یہ لازم ہے کہ اگر ان ملکوں میں کوئی مسلمان یا غیر مسلم یا ہندوستان میں کوئی مسلمان یا غیر مسلم ان کے حقوق کو غصب کرلے تو وہ اس کی دادرسی کے لیے اس وقت تک کا انتظار کرے جب تک ان ممالک میں خالص اسلامی حکومت قائم نہ ہو جاوے؟ کیا محض اس بات کا علم ہی کہ مسلمان ان ملکوں میں اپنے حقوق کے اتلاف کی کوئی دادرسی ملکی عدالتوں میں نہیں کریں گے غیر مسلموں کو خاص طور پر اس پر دلیر نہیں کردے گا کہ وہ بے دھڑک مسلمانوں کے حقوق کا اتلاف کریں؟ مودودی شریعت مسلمانوں کے لیے ایسی تنگی اور عسر پیدا کرنے کی روادار ہو تو ہو اسلامی شریعت ایسی تنگی پیدا کرنے کی روادار نہیں ہوسکتی۔ مسلمان خود حضورؐ کے زمانہ میں ہجرت کرکے حبشہ گئے اور کئی سال تک حبشہ میں رہے۔ کیا کوئی حدیث یا روایت ایسی ہے کہ جو یہ ثابت کرتی ہو کہ اس ہجرت کے زمانہ میں مسلمانوں کو ملکی عدالتوں میں استغاثہ کرنے سے روکا گیا تھا؟ مسلمان چین میں بطور فاتح کے کبھی نہیں گئے بلکہ بطور تجارت کے گئے اور ان کی بڑی بڑی آبادیاں چین میں قائم ہوگئیں اور اب تک ہیں۔ مسلمان اور غیر مسلموں

کے درمیان کچھ نہ کچھ مناقشات ان مقاموں میں ضرور ہوئے ہوں گے۔ کیا مسلمان ان سب گذشتہ صدیوں میں ملکی عدالتوں میں استغاثہ دائر کرنے سے پرہیز کرتے رہے ؟ اگر نہیں پرہیز کیا اور ملکی عدالتوں میں استغاثے دائر کرتے رہے تو کیا ان کا یہ سب عمل ناجائز اور حرام تھا ؟ مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کی طرف سے کہا جاوے گا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ مسلمان خود اپنی حکومت بنا دیں، یا ان ممالک سے ہجرت کر جادیں۔ تو حکومت کا بنانا اس مظلوم کے اختیار میں تو نہیں ہے جس کے ساتھ ظلم ہوا ہے یا جس کی زمین یا مکان غصب کیا گیا ہے یا جس کی عورت کی بے حرمتی کی گئی ہے، یا جس کے بیٹے یا بھائی کو قتل کیا گیا ہے۔ رہی ہجرت تو ہندوستان کے ۹ یا ۱۰ کروڑ مسلمان یا چین کے دو چار کروڑ مسلمان ہجرت کر کے کہاں جا سکتے ہیں اور کون ایسا ملک خالی پڑا ہے کہ جس میں وہ سما سکیں ؟ علاوہ بریں مولانا مودودی صاحب اور "اسلامی جماعت" کے کہنے کے مطابق تو اسلامی ممالک مثل افغانستان، ترکی، مصر وغیرہ میں سے بھی کوئی ایسا نہیں ہے جہاں مسلمان ہجرت کر کے جا سکتا ہے کیونکہ مودودی صاحب کے نظریہ کے مطابق ان سب میں بھی جو حکومتیں قائم ہیں وہ سب طاغوت کی حکومتیں ہیں اس لیے بیچارے مسلمانوں کے لیے "نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن" کا مضمون ہے۔ کیا دین اسلام ایسے ناقابل العمل نظریوں کا حامل ہو سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں۔ جو مسئلہ زیر بحث تھا اس کے متعلق مجھکو جو کچھ عرض کرنا تھا وہ تو میں عرض کر چکا۔ اب مجھکو چند الفاظ مولانا مودودی صاحب کے اس ادعا کی بابت عرض کرنا ہیں کہ "اسلامی جماعت" ہی صرف وہ جماعت ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی صحیح سیاسی رہنمائی کر رہی ہے، باقی جتنی دیگر سیاسی جماعتیں ہیں خواہ وہ مسلم لیگ ہو، احرار ہوں، خاکسار ہوں، یا آزادی پسند علماء ہوں (جن میں غالباً جمعیۃ العلماء بھی شامل ہے) ان سب جماعتوں کی اس باب میں اس وقت تک کی کل کارروائی مثل حرف باطل کے مٹا دینے کے قابل ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب اور "جماعت اسلامی" کے دستور، پروگرام یا لائحہ عمل میں اس وقت تک کوئی ایسی بات ہے جو اسلامی جماعت کو اس تفاخر و مباہات کا حق دیتی ہو ؟ مولانا مودودی صاحب کی تقریر و تحریر اور جماعت اسلامی کے دستور اور جماعت اسلامی کے اجتماعات کی روداد کو آپ پڑھ جایئے، جو بات آپ کی توجہ خاص طور پر اپنی طرف کھینچے گی وہ نواہی کی کثرت اور اوامر اور عمل کی کمی یا فقدان ہو گا۔ مثلاً نے منہیات شرعیہ کی جو فہرست مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کی طرف سے ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تیار کی گئی ہے اس میں سے بعض یہ ہیں :-

(۱) ملک میں جو نظام حکومت قائم ہے یا آئندہ قائم ہو اس کا رکن بننا ممنوع ہے۔

(۲) کسی میونسپل بورڈ یا ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر بننا ممنوع ہے۔

(۳) ملکی عدالتوں میں مستغیث یا مدعی بن کر جانا ناجائز ہے۔

(۴) ملکی عدالتوں میں بطور وکیل کے پیروی کرنا ناجائز ہے۔

(۵) موجودہ نظام حکومت کی کسی قسم کی ملازمت اختیار کرنا ممنوع ہے

(۱)، (۲) اور (۵) کے ذریعہ سے اگر مسلمانوں کو آمدنی ہو تو اس کا کھانا ناجائز اور حرام ہے۔ اسی کے ساتھ اگر پوچھا جاوے کہ کوئی اوامر بھی مولانا مودودی صاحب یا "اسلامی جماعت" کی طرف سے جاری ہوئے یا نئے اعمال (جو مسلمانوں کو کرنا چاہئیں) ان کی کوئی فہرست مولانا مودودی صاحب یا "اسلامی جماعت" کی طرف سے شائع ہوئی تو جواب آپ کو نفی میں ملے گا۔ خود افراد جماعت اسلامی کو اس کا احساس ہے اور وہ امیر جماعت سے دریافت کرتے ہیں کہ ہمیں کچھ کام کرنے کو بتایا جاوے تو محض لفاظی کے ذریعہ سے ان کا منہ بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اجتماع دربھنگہ کی روداد میں (دیکھو ترجمان القرآن بابت نومبر و دسمبر ۱۹۴۳ء صفحہ ۲

مولانا مودودی صاحب خود فرماتے ہیں "بہت سے ارکان جماعت ایسے ہیں جنھوں نے مجھ سے بالمشافہ اور بالمراسلہ یہ سوال کیا ہے کہ ہمارے لیے پروگرام کیا ہے اور ہم کیا کریں۔ یہ پروگرام کا مطالبہ اور یہ تصور کہ ان لوگوں کے کرنے کے لیے کوئی کام بتایا نہیں گیا اس کی بنا یہی ہے کہ ہمارے رفقا ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھے ہیں کہ جس تحریک کی خدمت کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو پیش کیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔" اس اوپر کے اقتباس سے کم از کم یہ تو ثابت ہو گیا کہ جماعت اسلامی کا سیاست میں یا کسی دوسرے میدان عمل میں کوئی پروگرام نہیں ہے نہ افراد جماعت کو ابھی تک یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کیا کریں۔ مزید برآں اسی دربھنگہ کے اجتماع کے موقع پر رفقا میں سے ایک صاحب نے ایک اسکیم پیش کی کہ "ارکان جماعت کو مال حرام سے اجتناب کی وجہ سے جو مالی مشکلات پیش آتی ہیں انھیں دور کرنے کے لیے مختلف مقامات پر اس طرز کی کاروباری اسکیمیں عمل میں لائی جاویں کہ کچھ مال دار اور کچھ کارندے مل کر دولت فراہم کریں اور یہ دولت ایک مقررہ تناسب سے سرمایہ لگانے والوں، محنت کرنے والوں اور جماعت کے بیت المال پر تقسیم ہوتی رہے۔۔۔۔۔" (دیکھو صفحہ ۵۰۹ ترجمان القرآن بابتہ نومبر و دسمبر ۱۹۴۳ء)

اس تجویز کی مولانا امین احسن صاحب نے مخالفت کی اور فرمایا کہ جماعت کو اپنی جماعتی حیثیت میں اعلائے کلمۃ اللہ کی دعوت اور جد و جہد کے سوا کوئی کاروباری حرکت نہیں کرنا چاہیے۔ امیر جماعت نے مولانا امین احسن کی اس رائے کی تائید فرمائی اس لیے محرک کو اپنی تجویز واپس لینا پڑی۔ اگرچہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ کسی جماعت کا مسلمانوں کی معاشی حالت کی درستی کی کوشش کرنا اس جماعت کی اعلائے کلمۃ اللہ کی دعوت میں حارج بن سکتا ہے تاہم اس تحریک پر بحث سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ اسلامی جماعت مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا کوئی کام نہیں کرنا چاہتی نہ کوئی ایسا کام اس کے پروگرام میں ہے اور اعلائے کلمۃ اللہ کی دعوت کا بھی کوئی عملی پروگرام نہ مولانا مودودی صاحب کی کسی تقریر یا تحریر میں ہے نہ اسلامی جماعت کے دستور میں اس کی بابت کوئی دفعہ درج ہے نہ پبلک کے علم میں آیا کہ مولانا مودودی صاحب یا اسلامی جماعت نے اس وقت تک کوئی عملی اقدام اعلائے کلمۃ اللہ کی بابت کیا۔ نومبر ۱۹۴۳ء سے اس وقت تک جماعت اسلامی کے رفقا کے متعدد اجتماع دربھنگہ، دہلی اور حیدر آباد دکن میں ہو چکے ہیں ان اجتماعوں کی روئدادوں کو ملاحظہ کیجئے ان سے بالکل ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی جماعت نے کوئی نیا قدم، نیا عمل، نئی کارروائی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کی ہو یا کوئی عملی کارروائی ایسی کی ہو یا کوئی عملی کارروائی اس کے پروگرام میں ایسی ہو جو موجودہ نظام حکومت کی قوت یا اثر کو کم کرنے یا مسلمانوں کے اثر یا قوت کو بڑھانے کا موجب ہو سکتی ہو۔ اگر کی ہے تو مولانا مودودی صاحب اور دیگر ارکان جماعت اس کو ظاہر فرماویں۔ یہی نہیں کہ جماعت اسلامی کی طرف سے اعلائے کلمۃ اللہ کے متعلق ابھی تک کوئی عملی کارروائی نہیں کی گئی بلکہ اگر کوئی دوسری جماعت اس باب میں کوئی عملی اقدام کرتی ہے تو مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کی طرف سے اس کی ہر طرح تنقیص کی جاتی ہے اور مسلمان عوام کی نگاہ میں اس کو مردود و منغوض بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اعلائے کلمۃ اللہ کے دیگر ذرائع میں سے ایک ذریعہ یقینی طور پر یہ بھی ہے کہ جملہ کلمہ گو مسلمانوں کی تنظیم کی جاوے اور ان کو ایک سلسلہ میں منسلک کر کے ان کی اجتماعی قوت کو بڑھایا جاوے۔ مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ مسلمانوں کی تنظیم کا کام اپنے ذمہ لیتی ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کرتی ہے مگر مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کی طرف سے مسلم لیگ کی اس کے اس گناہ تنظیم کی بابت کیا کچھ تنقیص و تشنیع نہیں کی جاتی۔ اس لیے جماعت اسلامی کی طرف سے مناہی کی فہرست میں اسقدر اضافہ اور عمل کا یہ فقدان ہرگز اعلائے کلمۃ اللہ کا موجب نہیں ہو سکتا کیونکہ شارع اسلام کے یہاں امر کو نہی پر ہمیشہ مقدم کیا گیا ہے۔ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی۔ اور ایمان کے ساتھ عمل نیک کی کلام پاک میں بار بار تاکید آئی ہے اور عمل کا ہی مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے یہاں فقدان ہے۔ کم از کم جماعت اسلامی کے دستور اور جماعت اسلامی کے اجتماعوں کی روداد سے

پتہ نہیں چلتا کہ جماعت اسلامی نے اپنے افراد کے لیے کوئی نئے اوامر جاری کیے ہیں یا جماعت اسلامی کے افراد نے کہیں ایسے نئے اعمال یا افعال کا کرنا اختیار کیا ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ کا باعث بن سکیں یا جو مسلمانوں کی دینی یا دنیاوی فلاح و بہبود کا موجب بن سکیں اور جو افعال و اعمال عام مسلم نہ کرتے ہوں۔ لہذا جہاں تک عمل اور اعلاء کلمۃ اللہ کی طرف عملی اقدام کا تعلق ہے، افراد جماعت اسلامی اور عام مسلمانوں کی حالت میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اگرچہ منہیات سے بچنا افراد اور جماعتوں دونوں کے لیے نہایت ضروری ہے تاہم کوئی قوم یا کوئی جماعت سلبی صفات کی بنا پر ترقی نہیں کرسکتی بلکہ ایجابی قوتوں کے زور پر ترقی کرتی ہے۔ مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت نے جو نئے نواہی کا اضافہ شرع اسلام میں کیا ہے ان کی بابت میں ثابت کرچکا ہوں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی شرع سے ثابت نہیں ہے لیکن بالفرض اس کی صحت کو تسلیم بھی کرلیا جاوے اور ان پر مسلمان عامل بھی ہو جاویں تو بھی ایسا عمل مسلمانوں کو حقیقی ترقی کی طرف نہیں لیجا سکتا۔ جو چیز مسلمانوں کو حقیقی ترقی کی طرف لے جاسکتی ہے اور درحقیقت اعلاء کلمۃ اللہ کا باعث بن سکتی ہے وہ عمل، ٹھوس عمل، سراسر عمل، پیہم عمل ہے اور اسی چیز کا مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کے یہاں فقدان ہے۔

اس حقیقت سے تو کسی منصف مزاج شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں تک اخلاقی اور شرعی مناہی سے بچنے کا تعلق ہے ہم مسلمان مغربی اقوام میں سے کسی سے بدتر حالت میں نہیں ہیں بلکہ مغربی اقوام میں اکثر و بیشتر اس بات میں ہم سے بدتر ہیں۔ اگرچہ ہماری اخلاقی حالت بھی کچھ بگڑ گئی ہے تاہم شرابخوری، قماربازی، زناکاری اور دیگر بیحیائی اور فحش کی باتوں میں اکثر مغربی اقوام ہم سے بہت آگے بڑھی ہوئی ہیں۔ باوجود ان معائب کے مغربی اقوام ہم پر ہر پہلو سے غالب اور مستولی ہیں۔ یہ کیوں؟ یہ محض اس وجہ سے کہ مغربی اقوام کے مقابلہ میں ہمارے یہاں فقدان عمل ہے۔ نہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں سے اس قدر کام لیتے ہیں نہ دماغ سے جس قدر کہ مغربی اقوام۔ نہ ہم فطرتی قوتوں کو مسخر کرکے اپنے کام میں لانا چاہتے ہیں نہ اجتماعی فائدہ کے لیے ذاتی مفاد کو قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہم مسلمانوں میں بدقسمتی سے پہلے ہی سے بہت کچھ جمود و تعطل موجود ہے۔ مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت نواہی شرعیہ کی فہرست میں معتدبہ اضافہ کرکے اور ہمارے عمل کو جہاں تھا وہیں چھوڑ کر ہماری ترقی کو معکوس کرانا چاہتے ہیں۔

مولانا مودودی صاحب اور اسلامی جماعت کی نظر میں اگر کوئی مسلمان موجودہ کونسلوں کی ممبری سے استعفا دیدے، میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبری چھوڑ دے، ملکی عدالتوں میں وکالت کرنے سے اجتناب کرے، ملکی عدالتوں میں باوجود مظلوم ہونے کے استغاثہ دائر کرنے سے پرہیز کرے تو گویا اس نے بڑی خدمت دین کی اور اس کی یہ سلبی کارروائیاں بہت کچھ اعلاء کلمۃ اللہ کا باعث بن گئیں اور گو یہ کارروائیاں کرنے سے اس سادہ لوح مسلمان کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ جو کچھ دین کی خدمت اس پر واجب تھی اس کو اس نے باحسن الوجوہ انجام دیدیا اور اس کے بعد اس کو اور کچھ کرنا نہیں ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس جیسی سلبی کارروائی کوئی اصلی خدمت دین نہیں ہے۔ اصلی خدمت دین یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسری اقوام سے اگر بہتر نہیں تو ان کی برابر تو ضرور اچھا اور کامیاب کاشتکار، اچھا اور کامیاب تاجر، اچھا اور کامیاب سائنسداں، اچھا اور کامیاب مجاہد فی سبیل اللہ بنے۔ اس اور صرف اسی طریقہ سے ایک مسلمان اپنی اور اپنے اہل و عیال کی خدمت کے ساتھ سچی خدمت دین کر سکتا ہے۔ چونکہ مولانا مودودی صاحب اور ان کی اسلامی جماعت نے مسلمانوں کے مرض کی جو تشخیص کی ہے وہی غلط ہے اس لیے ان سے اس کے صحیح مداوے کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔ رہا مسلمانوں کی صحیح سیاسی رہنمائی کا بلند بانگ دعویٰ تو اس کے متعلق صرف اس قدر عرض ہے کہ اسلامی جماعت کے موجودہ پروگرام اور لائحہ عمل کے مطابق مسلمانوں کے لیے موجودہ نظام حکومت یا کسی آئندہ قائم ہونے والے نظام حکومت میں اس حکومت کا محکوم ہو کر رہنا تو جائز ہے مگر اس نظام حکومت کا باوجود قدرت کے حصہ دار اور شریک کار بنکر رہنا ناجائز اور حرام ہے۔ برخلاف اس کے کانگریس اور اس کے

ہم خیال علما، (آزادی پسند علما) کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو غیر مسلم نظام حکومت میں اقلیت کی حیثیت سے حصہ دار بن کر رہنا چاہیے اور مسلم لیگ کا نصب العین یہ ہے کہ کم از کم ان صوبوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں مسلمان اکثریت کی حکومت قائم ہو۔ اب یہ ناظرین کا کام ہے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں کہ ان تینوں جماعتوں میں سے کونسی جماعت مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر رہی ہے۔ فتدبر۔

ترجمان القرآن ۔ ہم جناب خان بہادر صاحب کے بہت شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس مسئلے کو چھیڑ کر ہمیں پھر ایک مرتبہ اپنا نقطۂ نظر صاف صاف پیش کرنے کا موقع بہم پہنچا دیا۔ اگرچہ پچھلے تجربات کی بنا پر خود صاحب موصوف سے تو یہ امید نہیں ہے کہ وہ ہمارے دلائل ملاحظہ فرمانے کے بعد اپنی رائے میں ذرہ برابر بھی کوئی ترمیم کرنے پر راضی ہوں گے، لیکن ہم اس بحث میں اپنا وقت صرف اس امید پر صرف کر رہے ہیں کہ دوسرے بہت سے طالبین حق کو اس سلسلہ میں اکثر ان گمراہ کن دلائل کا جواب مل جائے گا جو اطاعت غیر اللہ یا بالفاظ دیگر اسلام بغیر اللہ کو جائز قرار دینے اور نظام کفر کی بندگی کو مباح بلکہ فرض کفایہ ٹھیرانے کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں۔

قصہ یوسف علیہ السلام کے زیر نظر پہلو پر ہم اس سے پہلے دو مرتبہ بحث کر چکے ہیں۔ پہلی مرتبہ رمضان و شوال ۱۳۷۲ھ کے "اشارات" میں۔ دوسری مرتبہ ربیع الاول و ربیع الثانی ۱۳۷۳ھ کے "رسائل و مسائل" میں۔ پہلی بحث زیادہ مفصل و مدلل تھی اور دوسری مجمل و مختصر۔ لیکن جناب خان صاحب نے نہ معلوم کیوں پہلی کو چھوڑ کر دوسری کو مدار گفتگو بنایا، حالانکہ جو اعتراضات انھوں نے اپنے مضمون میں درج فرمائے ہیں ان میں سے اکثر کا، بلکہ شاید سب ہی کا جواب ہماری پہلی بحث میں انھیں مل جاتا۔ بہرحال یہ عدم التفات خواہ کسی وجہ سے ہو، ہمارے لیے اس میں خیر ہی کا پہلو شامل آیا کہ جن باتوں کو خود بار بار چھیڑ کر واضح کرنا ہمارے لیے مشکل تھا انھیں دوسروں کے چھیڑنے پر بیان کرنے کا ہمیں موقع مل گیا۔

دنیا میں ایک معقول آدمی سے جن چیزوں کی توقع کی جاتی ہے غالباً ان میں سب سے پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ اس کی باتوں میں تناقض نہ ہو۔ ایک معمولی عقل کا گنوار آدمی بھی جب کسی شخص کو ایسی باتیں کرتے دیکھتا ہے جو ایک دوسرے کے خلاف پڑتی ہوں تو فوراً ٹوک دیتا ہے، کیونکہ اس کی نہایت موٹی عقل بھی متناقض باتوں کی غیر معقولیت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ جن باتوں کی توقع کسی گھٹیا سے گھٹیا گرد ذی عقل انسان سے نہیں کی جا سکتی ان کی توقع اس خدا سے کی جاتی ہے جو خود عقل کا خالق اور تمام حکمت کا مالک ہے۔ اور اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ خدا سے اس انتہائی نامعقولیت کی توقع رکھنے والے، بلکہ اس کا مطالبہ کرنے والے کوئی جاہل، کودن لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ علما ہیں جو دنیا بھر کو علم و عقل کے درس دیتے ہیں اور وہ فضلا ہیں جن کی عقلیں اپنی دنیا کے معاملات چلانے میں خوب لڑتی ہیں۔ یہ ہوش مند حضرات اپنے خدا سے چاہتے ہیں اور یہ امید بھی رکھتے ہیں کہ اس کی باتوں میں تناقض ہو، یعنی وہ یہ بھی کہے کہ میں بادشاہ زمین و آسمان ہوں اور پھر اپنی زمین کے کسی گوشے پر کسی اور کی بادشاہی تسلیم بھی کرے۔ وہ یہ بھی کہے کہ لوگو تم سب میرے احکام کی اطاعت کرو اور پھر لوگوں کو یہ اجازت بھی دے بلکہ اس کو فرض تک قرار دیدے کہ ان حاکموں کی اطاعت بجا لائیں جو اس کے حکم کی سند کے بغیر اور اکثر حالات میں اس کے حکم کے خلاف احکام دیتے ہوں۔ وہ انسانوں کے لیے خود ایک قانون بھی بنائے اور یہ اعلان بھی کرے کہ میرا ہی قانون حق ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے باطل ہے اور پھر دوسرے قوانین کے نفاذ کو جائز بھی رکھے اور انہی انسانوں کو جن کے لیے اس نے قانون بنایا ہے یہ "حق" بھی دے کہ چاہیں خود اپنے لیے قانون بنالیں اور چاہیں دوسروں کے قوانین کی پیروی کرتے رہیں۔ وہ اپنے پیغمبروں کو خاص اسی غرض کے لیے مبعوث بھی کرے کہ زمین کے باشندوں کو اس کا دین قبول کرنے کی دعوت دیں اور پھر انہی پیغمبروں کو یا ان میں سے کسی کو اس بات کی اجازت بھی دے

(بلکہ خان بہادر صاحب کے بقول اس خدمت پر سرا سے بھی) کہ ایک سو کبھی اور دین کے نظام میں کارکن و خدمت گزار بن جائیں اور اسے کامیابی کے ساتھ چلانے میں اپنی تمام قابلیتیں صرف کر دیں۔ وہ ساری دنیا کے باشندوں میں سے چھانٹ کر ایک امت خاص اِس مقصد کے لیے بنائے بھی کہ اُس معروف کا حکم دے جسے اس نے معروف قرار دیا ہے اور اس منکر کو مٹائے جسے اس نے منکر ٹھیرایا ہے اور پھر اسی امت کے لیے اس بات کو حلال بلکہ اس کے بعض "برگزیدہ" افراد کے لیے فرضِ کفایہ بھی ٹھیرا دے کہ اُن منکرات کو قائم کرنے اور رواج دینے میں حصہ لیں جنھیں اس کے باغی معروف ٹھیرا چکے ہیں اور ان معروفات کو بدلنے اور مٹانے میں آلۂ کار بنیں جو اس کے نافرمانوں کی نگاہ میں منکر قرار پا چکے ہیں۔ یہ ایسی صریح متناقض باتیں ہیں جن کے تناقض کو سمجھنے کے لیے کسی گہرے غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے، لیکن جو لوگ تفسیریں لکھنے اور فقہ و معقولات کے درس دینے کی قابلیت رکھتے ہیں اور جو اتنی عقل رکھتے ہیں کہ کلکٹری اور دیوانی جیسے بڑے بڑے مناصب کی ذمہ داریاں سنبھال سکیں انھیں یا تو ان باتوں میں کوئی تناقض نظر نہیں آتا یا پھر خداوندِ عالم کے متعلق ان کی رائے اتنی بری ہے کہ وہ اس سے ان بے عقلیوں اور نادانیوں کی توقع رکھتے ہیں جنھیں ایک جاہل گنوار بھی اپنی چوپال کے کسی رفیق میں پا کر صبر نہیں کر سکتا۔

خان بہادر صاحب اپنے اسی مضمون میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک بعد کی آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف کے خزائن مصر پر متصرف ہونے کے بعد تک فرعون مصر کی سلطنت قائم تھی اور فرعون مصر کا دین ہی ملک میں جاری تھا۔۔۔۔۔ ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک الا ان یشاء اللہ (یہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس بادشاہ کے مگر جو چاہے اللہ) یہ عبارت صاف بتاتی ہے کہ مصر کا ملکی قانون اس وقت تک مصر میں جاری تھا۔"

ان الفاظ کو تحریر کرتے وقت صاحب موصوف جس بات کے ثابت کرنے کی دُھن میں لگے ہوئے تھے اس نے شاید انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ کچھ دیر ٹھیر کر اس صریح تناقض پر غور کر لیتے جو ان کی مزعومہ تفسیر کے لحاظ سے یہاں قرآن کے بیان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ براہ کرم اب وہ ہمارے ہی توجہ دلانے سے غور فرمائیں۔ یہاں خود ان کے اعتراف کے مطابق مصر کے ملکی قانون کو، جو فرعون مصر کی حاکمیت کی بنا پر بنا تھا، "دین الملک" (بادشاہ کا دین) قرار دیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر دین صرف اس پوجا پاٹ ہی کا نام نہیں ہے جو مندروں اور معبدوں میں کی جاتی ہے بلکہ اس قانون کا نام بھی ہے جس کے مطابق پولیس مجرموں کو پکڑتی ہے، جس کے تحت عدالت معاملات دیوانی و فوجداری کا فیصلہ کرتی ہے، جس کی پیروی میں ملک کا انتظام چلایا جاتا ہے اور جس پر تمدن کا سارا نظام قائم ہوتا ہے۔ زندگی کے یہ سارے شعبے بحیثیت مجموعی جس طریقے پر چلتے ہیں اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "دین" ہے۔ اور چونکہ ملک مصر میں وہ طریقہ فرعون کی مشیت سے ماخوذ اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ پر مبنی تھا اس لیے قرآن اس کو "دین الملک" کہہ رہا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ "دین اللہ" بھی صرف اس چیز کا نام نہیں ہے جو سجدوں اور نماز روزے تک محدود ہو بلکہ اس سے مراد بھی اس پوری شریعت کی پابندی ہے جو اللہ کی رضا سے ماخوذ اور اس کی حاکمیت پر مبنی ہو اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لے لے۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبی ہونے کی حیثیت سے کس کام کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے؟ "دین اللہ" کی دعوت دینے کے لیے؟ یا "دین الملک" کو فروغ دینے کے لیے؟ اگر خان بہادر صاحب کی تاویل اور ان حضرات کی تفسیر جن کے بڑے بڑے نام لے کر خان بہادر صاحب ہم کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں، مان لی جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو اپنے نبی کو اس بات پر مامور فرمایا کہ اس کی مخلوق کو اور خصوصاً اس مخلوق کو جو مصر میں رہتی تھی "دین اللہ" اختیار کرنے کی دعوت دے، اور دوسری طرف وہی نبی خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت و نگرانی میں "دین الملک" کے قیام و استحکام کی خدمت انجام دینے لگا اور لطف یہ ہے کہ اللہ میاں اس صریح تناقض

طرزِ عمل کا تناقض محسوس تو کیا فرماتے الٹا اس نبی کے اس فعل کو، خان بہادر صاحب کے اپنے الفاظ میں، سراہنے لگے اور نظامِ کفر میں اپنے نبی کے عہدۂ وزارت فائز ہوجانے کو "انعامِ خداوندی" سے تعبیر فرمانے لگے، گویا کہ اللہ میاں کا حال بھی معاذ اللہ ہمارے موجودہ زمانے کے ان دین دار بزرگوں کا سا ہے جو خود تو پیشانی پر سیاہ گٹا لیے ہوئے مصلے پر تسبیح گردانی فرما رہے ہوتے ہیں مگر صاحبزادے جب ایم اے پاس کرکے نیم انگریز بنے ہوئے آبکاری کی انسپکٹری پر فائز ہوجاتے ہیں تو وہی دینِ مجسم بزرگ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کے خاندان کو اپنی نعمت سے نواز دیا۔

آگے چل کر خان بہادر صاحب پھر فرماتے ہیں:

"اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ملکِ مصر کی وزارت پر متمکن ہوجانے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے تبلیغِ حق کا کام نہیں کیا یا اپنی رسالت کے اعلان سے گریز کیا۔ برخلاف اس کے صاحبِ ممدوح نے اس وقت جبکہ آپ جیل میں تھے اسی وقت وحدانیت کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ ...... البتہ جو بات ان آیات سے بلا شک وشبہ کے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظامِ حکومت کے رکن خود اپنی خواہش اور درخواست پر بنے اور حضرت یوسف کے اس حکومت کے رکن بننے کے بعد بھی ملک میں غیر اسلامی نظامِ حکومت اور غیر اسلامی قانون ہی نافذ رہا۔"

یہاں پھر کھلا ہوا تناقض پایا جاتا ہے جس کی طرف صاحبِ موصوف نے اپنے مدعا کی دُھن میں توجہ نہیں فرمائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے آخر کس قسم کی وحدانیت کی تبلیغ فرمائی تھی؟ اگر اس "وحدانیت" کے معنی یہ تھے کہ وہ پوجا جو معبدوں میں کی جاتی ہے اور وہ اطاعت قانون جس پر سوسائٹی کا نظم اور ملک کا انتظام قائم ہوتا ہے ایک ہی خدا کے لیے ہو یعنی پوری زندگی دین اللہ کی تابع ہوجائے، تو خان بہادر صاحب کی تاویل کے لحاظ سے حضرت یوسفؑ نے خود اپنی اس تبلیغِ حق کے خلاف عمل کیا۔ اور اگر یہ تبلیغ اس بات کی تھی کہ معبدوں میں "دین اللہ" جاری ہو اور ملک اور سوسائٹی کا سارا انتظام "دین الملک" پر بدستور چلتا رہے تو ظاہر ہے کہ یہ وحدانیت کی نہیں بلکہ ثنویت اور دو عملی کی تبلیغ تھی۔ پھر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنی رسالت کا اعلان آخر کس معنی میں کیا تھا؟ اگر انھوں نے فرعون سمیت تمام لوگوں سے یہ کہا تھا کہ میں بادشاہِ زمین و آسمان کا نمائندہ ہوں لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، جیسا کہ تمام انبیاء کہتے رہے ہیں فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ، تو اس اعلان کے ساتھ ان کا فرعون کی بادشاہی تسلیم کرنا اور اس کی اطاعت میں اسلامی نظام کے بجائے غیر اسلامی نظام کی خدمت انجام دینا کسی طرح مطابقت نہیں رکھتا۔ اور اگر انھوں نے یہ کہا تھا کہ لوگو! میں ہوں تو بادشاہِ ارض و سما کا نمائندہ مگر میرا مسلک یہ ہے کہ فرعونِ مصر کی اطاعت کروں اور تم کو بھی یہی دعوت دیتا ہوں کہ اسی کی اطاعت کرو تو صرف یہی نہیں کہ یہ ایک صریح متناقض بات کا اعلان تھا جس کا استقبال سنجیدگی کے بجائے قہقہے کے ساتھ ہونا چاہیے تھا اور ایسا اعلان کرنے والے کو ایوانِ وزارت کے بجائے پاگل خانے میں جگہ ملنی چاہیئے تھی، بلکہ آج بھی ایسی کتاب ہرگز ایمان لانے کے قابل نہیں رہتی جو ایک طرف تو خود ہی یہ قاعدہ کلیہ بیان کرتی ہے کہ "خدا نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کے تحت وہ مطاع بن کر رہے" (وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ) اور دوسری طرف وہی کتاب ایک ایسے شخص کو رسول بھی قرار دیتی ہے جو مطاع بن کر نہیں بلکہ غیر اللہ کا مطیع بن کر رہا اور دیگر بندگانِ خدا کو بھی اذنِ خداوندی کے تحت اپنا نہیں بلکہ اسی غیر خدا کا مطیع بناتا رہا۔ قرآن اپنے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں خود یہ معیار پیش کرتا ہے کہ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا "یعنی اگر یہ کتاب اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو لوگ اس میں بہت کچھ اختلاف بیان پاتے۔" لیکن اگر ہم خان بہادر صاحب اور ان کے طرزِ خیال کے لوگوں کی تاویلات تسلیم کرلیں تو قرآن کے بیانات میں یہاں ایسے کھلے ہوئے تناقضات پائے جائیں گے جن سے قرآن آپ اپنے ہی

پیش کردہ معیار کی رو سے اللہ کے سوا کسی اور کا کلام قرار پائے گا، بلکہ وہ "اُور" بھی جس کی تصنیف اسے سمجھائے گا بہرحال کوئی صحیح الدماغ انسان تو نہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ خان بہادر صاحب جس طرزِ خیال کی نمائندگی فرما رہے ہیں وہ اپنے پیچھے اخلاقی انحطاط کی ایک طویل اور دردناک تاریخ رکھتا ہے۔ مسلمان جب اپنے اصل مقصدِ زندگی کو بھول گئے اور اپنے حقیقی مشن کو چھوڑ کر دنیا پرستی میں مبتلا ہوگئے اور دین داری کے معنی ان کی نگاہ میں صرف یہ رہ گئے کہ عبادات اور معاشرت میں چند شرعی طور طریقوں کی پابندی کی جاتی رہے خواہ مقاصدِ زندگی وہی ہوں جو دنیا پرستوں کے ہوتے ہیں، خواہ نظامِ اجتماعی کی زمامِ کار صالحین کے ہاتھ میں ہو یا فجار کے ہاتھ میں، اور خواہ اجتماعی امامت اپنے اصول اور نصب العین کے اعتبار سے اسلامی ہو یا غیر اسلامی، تو اس غفلت کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں اس شکل میں دی گئی کہ ان کی بڑی بڑی آبادیاں پے در پے کفار کی تابع فرمان ہوتی چلی گئیں۔ لیکن انھوں نے اور ان کے علماء نے اسے سزا سمجھنے اور اس اصلی قصور کی، جس کی پاداش میں یہ سزا ملی تھی، تلافی کرنے کے بجائے الٹا یہ سوچنا شروع کر دیا کہ نظامِ کفر میں "اسلامی زندگی" کیسے بسر کی جائے۔ چنانچہ "اضطرار" کے بہانے سے اُس شرعی اور اسلامی زندگی کا ایک نیا نقشہ مرتب کیا گیا جو غیر شرعی اور غیر اسلامی نظام کے اندر بسر کی جا سکے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید سزاؤں کا سلسلہ شروع ہوا تاکہ انھیں آزمایا جائے کہ یہ سنبھل کر پلٹتے ہیں یا اپنی ضلالت میں بعید سے بعید تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اضطرار جسے ابتداءً صرف ایک ہی اضطرار سمجھا گیا تھا، اللہ کی سنت کے مطابق آگے بڑھا اور اس نے دائمی، روز افزوں اور غیر متناہی اضطراروں کی شکل اختیار کر لی، اور ہر نئے اضطرار نے مطالبہ کیا کہ جو حدود تم نے کفر کے اندر اسلام اور کفر کے ماتحت اسلامی زندگی کے لیے تجویز کیے ہیں انھیں سکیڑو اور سکیڑتے چلے جاؤ۔ مگر یہ جتنے عذاب خدا کی طرف سے آئے ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھولیں اور انھوں نے یہ قاعدہ طے کر لیا کہ دائمی ہر اضطرار کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اسلامی زندگی کے حدود سکیڑتے رہیں اور تسلطِ کفر کی حدوں کو پھیلنے دیں۔ پھر اس "اضطرار" کے تصور نے بھی انھیں ستانا شروع کیا کیونکہ اضطرار کے نیچے حرمت کا تصور لازماً موجود رہتا ہے۔ کون صاحبِ عقل اس صریح بات کو محسوس نہ کرے گا کہ جب آپ محض مضطر ہونے کی وجہ سے سور کا گوشت کھائیں گے تو بہرحال سور آپ کی نگاہ میں حرام تو ضرور ہی رہے گا، اور جب اسے آپ فی الاصل حرام سمجھتے ہوئے مجبوراً کھائیں گے تو نا ممکن ہے کہ آپ کے دل میں اس سے نفرت و کراہیت نہ ہو، نا ممکن ہے کہ آپ اس سے لذت لیں، شوق سے کھائیں، زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور پیٹ بھر کر کھانے کی کوشش کریں اور اس کے کباب اور قورمہ اور پلاؤ پکوانے کی فکر کریں۔ ایسا ہی تنفر اور اجتناب ان تمام معاملات میں بھی ناگزیر طور پر پیدا ہوتا ہے جنھیں آپ حقیقت کے اعتبار سے حرام سمجھتے ہوں اور صرف اضطرار کی وجہ سے اپنے لیے عارضی طور پر جائز کر لیں۔ مگر ایک پوری قوم کا اپنی زندگی کے سارے تمدنی، معاشی، سیاسی معاملات میں دائماً اس طرح رہنا کہ اس پر اضطرار کی شرعی و نفسیاتی کیفیت طاری رہے اور وہ حاضر الوقت نظامِ زندگی سے نفرت و کراہیت کے ساتھ ہمہ گیر اجتناب کرتی رہے اور صرف اُس حد تک اس سے تعلق رکھے جس حد تک ایسا تعلق جینے کے لیے ناگزیر ہو، عملاً محال ہے۔ ایسی حالت کو ایک قلیل مدت سے زیادہ برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ بہت جلدی طبائع اس سے تھک جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ تھکاوٹ بھی مسلمانوں میں ٹھیک اپنے وقت پر پیدا ہوئی، لیکن پہلے سے دینی انحطاط جس تسلسل کے ساتھ بڑھتا چلا آ رہا تھا اس نے ان تھکنے والوں کے ذہن کو اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا کہ اپنے اس غلط نظریہ پر نظرِ ثانی کرتے جو "نظامِ کفر میں اسلامی زندگی" کے امکان کے متعلق انھوں نے ابتداءً قائم کیا تھا اور اس حالتِ اضطرار کو ختم کرنے کی تدبیریں سوچتے جس کی وجہ سے وہ ہر طرف ہر شعبۂ زندگی میں حرمتوں سے محصور اور خبائث میں مبتلا ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس کے برعکس دینی انحطاط کی سابق رفتار انھیں جس رُخ پر بڑھا لے گئی وہ یہ تھا کہ سرے سے "اضطرار" کے بہانے ہی کو ختم کر دیں تاکہ جو حرمتیں نظامِ کفر میں ترقیات اور آسائشوں کے دروازے ان پر بند کیے ہوئے ہیں وہ ٹوٹ جائیں اور اباحت و حلت میں تبدیل ہو کر رہیں۔ اس غرض کے لیے دین کا ایک نیا نظریہ قائم کیا گیا کہ اس کا تعلق صرف عقائد و عبادات اور چند معاشرتی امور مثلاً نکاح و طلاق

سے ہے۔ اگر ان معاملات میں کوئی نظامِ حکومت مسلمانوں کو امن دینے کا ذمہ لے لے تو اسلامی زندگی کا اصل مدعا حاصل ہو جاتا ہے، اس کے بعد دارالکفر دارالامن ہے، اس کی وفاداری و اطاعت لازم ہے، اس کے تحت سارے تمدنی معاملات (جو اس نئے نظریہ کے مطابق دنیا بمقابلہ دین کے زیرِ عنوان آجاتے ہیں) انہی قوانین کے مطابق چلنے چاہئیں جو کافرانہ اصولوں پر بنائے گئے ہوں، اور اس کی قانونی و انتظامی مشین کو چلانے میں بلکہ اس کے تحفظ اور اس کی توسیع کے لیے جان و مال کی قربانیاں تک دینے میں بھی کوئی "مضائقہ" نہیں ہے۔ لیکن یہ معاملہ صرف "عدمِ مضائقہ" یا اباحت و حلت پر ہی نہ رکا بلکہ دارالکفر میں مسلمانوں کی ضروریات نے جلدی ہی انھیں مجبور کرنا شروع کیا کہ اپنی نئی نسلوں کو خدمتِ کفر کا شوق دلانے کی کوشش کریں تاکہ ان نقصانات کی تلافی ہو جو اول اول کچھ مدت کے "مضائقہ" نے انھیں پہنچا دیا تھا۔ اس لیے ایک آخری دلیل یہ تصنیف کی گئی کہ مسلمانوں کی ترقی و فلاح، اور بعض حالات میں ان کی زندگی کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ وہ نظامِ کفر کے عدالتی، تشریعی، انتظامی، فوجی، صنعتی، غرض تمام شعبوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں ورنہ امت کے وفات پا جانے یا کم از کم ترقی کی دوڑ میں غیر مسلموں سے پیچھے رہ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس دلیل نے بیک جنبشِ قلم اسی چیز کو جو کل تک صرف مباح کے مقام پر تھی فرض کے درجہ پر پہنچا دیا اور واجب ہو گیا کہ اگر ساری قوم نہیں تو اس میں سے ایک طبقہ تو اس فرض کے انجام دینے کے لیے ضرور نکلتا ہی رہے۔ گویا حکمِ الٰہی اب یوں قرار پایا کہ فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فی الكفر وليضلوا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يضلّون اور ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويامرون بالمنكر وينهون عن المعروف۔

یعنی یہی وہ عظیم الشان ترمیم تھی جس کی بدولت بڑے بڑے متقی و دیندار حضرات تسبیحوں کو گردش دیتے ہوئے وکالت اور منصفی کے پیشوں میں داخل ہوئے تاکہ جس قانون پر وہ ایمان نہیں رکھتے اس کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں اور کرائیں اور جس قانون پر ایمان رکھتے ہیں اس کی تلاوت صرف اپنے گھروں میں کرتے رہیں۔ اسی ترمیم کی بدولت بڑے بڑے صلحا و اتقیا کے بچے نئی درسگاہوں میں داخل ہوئے اور وہاں سے بے دینی و مادہ پرستی اور بداخلاقی کے سبق لے کر نکلے اور پھر اس نظامِ کفر کے صرف عملی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ اکثر حالات میں اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے بھی خدمت گزار بن گئے جو ان کے اسلاف کی غفلتوں اور کمزوریوں کی بدولت ان پر ابتداءً محض اوپر سے مسلط ہوا تھا۔ پھر اسی ترمیم نے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ مردوں سے گزر کر جاہلیت اور ضلالت اور بداخلاقی کا طوفان عورتوں تک پہنچا، وہی فرضِ کفایہ جسے ادا کرنے کے لیے پہلے مرد اٹھے تھے، عورتوں پر بھی عائد ہو گیا، اور ان بیچاریوں کو بھی آخر اس "دینی خدمت" کی بجاآوری کے لیے نکلنا پڑا، نہ نکلتیں تو خطرہ تھا کہ کہیں غیر مسلم ان سے بازی نہ لے جائیں!

اور کہیں یہ گمان نہ کر لیجیے گا کہ دین میں یہ ترمیم آج کچھ نئی ہوئی ہے۔ درحقیقت اس کی بنا آج سے صدیوں پہلے پڑ چکی تھی جبکہ تاتار کے کفار مسلمانوں پر مسلط ہوئے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ "نظامِ کفر میں اسلامی زندگی" کا نقشہ پہلی مرتبہ اسی دور کے علماء نے مرتب کیا تھا، بلکہ اسی زمانہ میں بڑے بڑے علماء و صلحاء نے خود نظامِ کفر کی خدمت گزاری اختیار فرمائی تھی، اور ان میں بکثرت لوگ وہ تھے جن کی کتابیں پڑھ پڑھ کر آج ہمارے مدارسِ عربیہ میں علماء دین و مفتیانِ شرعِ متین تیار ہوتے ہیں۔ اسی قدامت کی وجہ سے یہ غلطی ایک مقدس غلطی بن چکی ہے اور کوئی تعجب نہیں ہے اگر ہمارے زمانہ کے فقیہ اور محدث اور مفسر سب اس میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ غلطیاں نہ اس دلیل سے صحیح ہو سکتی ہیں کہ وہ پہلے سے ہوتی چلی آرہی ہے، اور نہ اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ بڑے بڑے لوگ اس میں مبتلا ہوئے ہیں۔ حق کا اثبات اگر ہو سکتا ہے تو خدا کی کتاب اور رسولوں کی سنت ہی سے ہو سکتا ہے۔

اس پورے انحطاط کے دوران میں، جو ابتدائی اضطرار کی بنا پر "اسلام زیرِ سایۂ کفر" کے نظریے سے شروع ہوا، پھر رفتہ رفتہ نظامِ کفر کی خدمت

جائز ـــــ مستحب ـــــ فرض کفایہ" کے نظریہ تک پہنچا، اور بالآخر گرتے گرتے اس انتہائی ذلیل نقطۂ نظر کی پستیوں میں جا گرا کہ "مذہبی آزادی دینے والے حکمرانوں کی وفاداری عین مقتضائے دین ہے"۔ مسلمانوں کی کوشش برابر یہی رہی کہ اپنے تنزل کے ہر مرحلے میں نیچے اور زیادہ نیچے اترنے کے لیے دلیل بہرحال انھیں خدا کے دین ہی سے ملنی چاہیے۔ یہ مطالبہ بظاہر تو ان کے زعم میں اس فارمولے پر مبنی تھا کہ "خدا کا دین چونکہ ہماری تمام ضرورتوں کا ضامن ہے اس لیے جو ضرورتیں اب ہمیں پیش آرہی ہیں ان کو پورا کرنے کے لیے بھی اسی دین سے ہم کو رہنمائی ملنی چاہیے"۔ لیکن دراصل اس ظاہری فارمولے کے باطن میں جو حقیقی فارمولا چھپا ہوا تھا اور جس پر فی الواقع یہ لوگ کام کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ "جب ہم نے اس دین پر یہ احسان کیا ہے کہ اس کو اپنے ایمان سے سرفراز کیا تو اس کے بدلے میں کم سے کم جو فرض اس دین پر عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے آگے چلنے کے بجائے ہمارے پیچھے چلنا شروع کر دے۔ یعنی اب ہمارا اور اس کا تعلق یہ نہ ہو کہ ہم اسے اپنے اوپر اور خدا کی زمین پر قائم کرنے کی سعی کریں اور اس سعی کے سلسلہ میں جو جو ضرورتیں ہم کو پیش آتی جائیں یہ انھیں پورا کرنے کی ضمانت لیتا جائے، بلکہ تعلق کی صورت اب یہ ہونی چاہیے کہ ہم اس کی اقامت کا کام حتی کہ اس کا خیال تک چھوڑ کر اپنے نفس کی پیروی میں جس جس وادی کی خاک چھانتے پھریں اس میں یہ ہمارے ساتھ ساتھ گرد شں کرتا رہے اور جن جن ادیانِ باطلہ کے ہم تابع فرمان بنتے جائیں ان کے ماتحت ساری غلامانہ ہیئتیں یہ بھی اختیار کرتا چلا جائے، اور اس کے منشاء کے خلاف جو جو طرز زندگی ہم قبول کریں ان میں پیش آنے والی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا یہ ضامن ہو"۔ چنانچہ اسی غلط نقطۂ نظر کو لیے ہوئے ان لوگوں نے قرآن اور سنت میں رہنمائی تلاش کرنی شروع کی اور حاصل یہ ہوا کہ پورے قرآن میں اگر کسی چیز پر جا کر ان کی نگاہ ٹھیری تو وہ نہ سورۂ عنکبوت تھی نہ بقرہ، نہ آل عمران، نہ انفال، نہ توبہ بلکہ صرف سورۂ یوسف تھی اور اس کی بھی وہ مقامات جن سے خان بہادر صاحب استدلال فرما رہے ہیں۔ اسی طرح پوری سیرت نبوی میں بھی اگر کوئی چیز ان کو قابل اتباع ملی تو وہ نہ مکے کی تپتی ہوئی ریت تھی، نہ طائف کی سنگ باری، نہ بدر و احد کے میدان بلکہ صرف یہ واقعہ کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ہجرت کر کے حبش گئی تھی اور وہاں ایک عیسائی بادشاہ کے ماتحت رعایا بن کر رہی!

لیکن جو شخص مطلب جو ذہنیت نہ رکھتا ہو بلکہ طالب حق ہو اس کے لیے یہ سوال غایت درجہ اہمیت رکھتا ہے کہ درحقیقت سورہ یوسف کے زیر بحث واقعات اور ہجرت حبشہ کے حالات سے بھی کیا وہی نتیجہ نکلتا ہے جو یہ حضرات نکالنا چاہتے ہیں، اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہی نتیجہ نکلتا ہے یعنی یہ کہ ایک نبی نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت ایک نظام کفر کی خدمت اور ایک غیر الٰہی قانون (دین الملک) کے اجراء و نفاذ کی ذمہ داری اسی غرض کے لیے قبول کی تھی کہ ایسا کرنا فی نفسہٖ مقصود تھا اور یہ کہ مسلمانوں نے مکے سے حبش کی طرف اسی بنیاد پر ہجرت کی تھی کہ ایک مسلم جماعت کے لیے ایک غیر مسلم نظام تمدن و سیاست بالکل ایک موزوں مقام ہے بشرطیکہ وہ مسجد میں اپنے منشاء کے مطابق پوجا کر لینے کی اور اپنے سینے میں کچھ عقائد رکھ لینے اور زبان سے ان کے پھاگ اڑا لینے کی اس کو اجازت دے دے تو اس کے بعد کچھ مزید سوالات پیدا ہوتے ہیں جو اوپر کے سوال سے بھی بدرجہا زیادہ اہم اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ یہ بات مان لینے کے بعد تو یہی امر تحقیق طلب ہو جاتا ہے کہ:

(۱) اللہ تعالیٰ نے جو دین انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے نوع انسانی کے لیے بھیجا آیا وہ صرف عبادہ گاہ کے لیے تھا یا پوری انسانی زندگی کے لیے؟

(۲) اور جو انبیاء اس دین کو لے کر آئے وہ سارے کے سارے ایک ہی مقصد کے لیے آئے تھے اور ایک ہی ان کا مشن تھا یا مختلف مقاصد اور مختلف مشنوں کے لیے جن میں سے بعض مشن بعض کی ضد پڑتے ہوں؟

(۳) اور یہ کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ فی الواقع کیا ہے؟ ـــــ اپنی پوری زندگی میں اس کی بندگی کرے اور اسی کے قانون کی

متابعت میں کام کرے یا صرف پوجا اس کی کرتا رہے اور باقی اپنے سارے معاملات جن طریقوں پر چاہے چلائے؟

ان سوالات کا ایک جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ نے جو دین بھیجا ہے اس کا تعلق صرف اُس محدود زندگی سے ہے جو آجکل کے تصور کے لحاظ سے "مذہبی" کہلاتی ہے، مگر یہ مان لینے کے بعد قرآن میں اور دوسری کتب آسمانی میں تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون دیوانی و فوجداری، ضوابطِ شہادت و عدالت اور مسائل صلح و جنگ وغیرہ کے متعلق جو ہدایات دی گئی ہیں وہ سب بے معنی قرار پاتی ہیں یا پھر ان کی حیثیت احکام کی نہیں بلکہ سفارشات کی رہ جاتی ہے جن پر عمل ہو جائے تو اچھا اور نہ ہو تو اللہ میاں کو کوئی خاص شکایت نہ ہوگی۔

اسی طرح دوسرے سوال کا جواب بھی یہ ہو سکتا ہے اور ہو سکتا کیا معنی، آجکل عام طور پر نبوت کا تصور یہی ہے کہ مختلف انبیاء مختلف مشن لے کر آئے ہیں حتیٰ کہ ایک نبی کا مقصد بعثت اگر یہ تھا ہے کہ نظام کفر کو توڑنے کے لیے لڑے اور اس کی جگہ نظام اسلامی کو زمین پر حکمران ہونے کی حیثیت سے قائم کرے تو دوسرے نبی کا مقصد بعثت اس کے برعکس یہ رہا ہے کہ نظام کفر کے اندر نہ صرف یہ کہ محدود قسم کی مذہبی و اخلاقی اصلاح پر اکتفا کرے، بلکہ اس نظام کفر کا مطیع و وفادار بنکر رہے اور موقع ملے تو اس کو چلانے اور فروغ دینے کے لیے اپنی خدمات خود پیش کرے۔ مگر یہ بات نہ قرآن کے بیان کے مطابق ہے جو پورے زور کے ساتھ یہ تصور پیش کرتا ہے کہ سارے انبیاء کا مقصد بعثت ایک ہی تھا اور نہ عقل یہ باور کرنے کے لیے تیار ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی متضاد اور متصادم حرکات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ شاید کوئی معقول آدمی بھی اُس خدا کو ایک حکیم خدا ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا جو انسانوں کی طرف اپنے پیغمبر کبھی کسی مقصد کے لیے بھیجے اور کبھی اس کے بالکل برعکس کسی دوسرے مقصد کے لیے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک نبی نظام اسلامی کو قائم کرنے کی جد و جہد میں کامیابی کے آخری مرحلوں پر پہنچ جائے، دوسرا نبی بیچ کے کسی مرحلے میں یا ابتدائی مرحلہ ہی میں آخر وقت تک کام کرتا رہے اور کوئی تیسرا نبی دعوت و تبلیغ یا جنگ کے بجائے کسی درمیانی صورت کو اپنے مخصوص حالات میں قابل عمل پاکر اسے اختیار کرے اور ان اشکال کے اختلاف کے باوجود مقصد سب کا ایک ہی ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے نظام زندگی کو مکمل طور پر دنیا میں قائم کرنے کی سعی کرنا۔ لیکن اس اختلافِ اشکال کو یہ معنی پہنانا کہ انبیاء کے مقاصد بعثت ہی سرے سے مختلف و متضاد تھے، اللہ پر ایسا بہتان لگانا ہے جس سے بدتر بہتان شاید کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح تیسرے سوال کا جواب بھی یہ ہو سکتا ہے، اور آج کل کے مسلمان بالعموم یہی سمجھتے ہیں کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اس کی پوجا کر لیا کرے اور کچھ مسائل غسل و طہارت اور چند مخصوص حدودِ حلال و حرام کی پابندی کرلے، اس سے آگے اللہ کا کوئی مطالبہ نہیں ہے اور اللہ کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ آدمی زندگی کے وسیع تر معاملات میں اپنے نفس کے قوانین کی پیروی کرتا ہے یا ان شیاطین جن و انس کے احکام کی، جو اس کی زمین پر مسلط ہو گئے ہیں۔ مگر یہ جواب موجودہ زمانہ کے دنیا پرستوں کے لیے خواہ کتنا ہی اطمینان بخش ہو اور خواہ "الدین یسر" اور "ما جعل علیکم فی الدین من حرج" کا یہ منشا قرار دے کر وہ اپنے لیے اس سے کتنی ہی سہولتیں پیدا کرلیں، بہرحال یہ تصور عبدیت و بندگی کے تصور کی قطعی نفی ہے۔ بندگی کا شاید اس سے زیادہ مضحکہ انگیز مفہوم کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ بندہ چوبیس ۲۴ گھنٹوں میں سے دو گھنٹوں کے لیے بندہ ہو اور باقی اوقات میں آزاد، یا صرف فاقوں سلامی دینے پر اس کی بندگی ختم ہو جائے اور پھر سارے کام اسے اپنے یا دوسروں کے منشا کے مطابق کرتے رہنے کی آزادی حاصل ہو۔ پھر وہ خدا تو ہرگز خدا ماننے جانے کے قابل نہیں ہے جو ایک طرف اپنے آپ کو انسان کا خالق اور رب بھی کہتا ہو اور دوسری طرف پورے انسان کو نہیں بلکہ اس کے ایک نہایت قلیل اور غیر اہم جز تک اپنی آقائی و فرمان روائی اور اس کی بندگی و غلامی کو محدود رکھنے پر راضی ہو۔ کوئی باپ اپنے بیٹے پر اپنی پدرانہ حیثیت کو، کوئی شوہر اپنی بیوی پر اپنی شوہرانہ حیثیت کو، کوئی حاکم اپنی مملکت اور اپنی رعایا پر اپنی حاکمانہ حیثیت کو اس حد تک محدود کرنے پر راضی نہیں ہوتا کہ چند مراسم اطاعت و وفاداری ادا ہو جانے کے بعد اس کی پدریت

اور شوہریت اور حاکمیت کا مقتضا پورا ہو جائے اور پھر بیٹے کو اختیار ہو کہ جس جس کو چاہے باپ بنا تا پھرے اور عورت کو اختیار ہو کہ جس جس کے لیے مناسب سمجھے وجہ سکون بنتی پھرے اور رعایا کو اختیار ہو کہ جس جس کے قانون کی چاہے پیروی کرے، جس کو چاہے ٹیکس دے اور جس کے احکام کی چاہے اطاعت کرتی رہے۔ مگر یہ خدا آخر کیسا خدا ہے کہ جو انسان سارا کا سارا اس کا مخلوق اور اسی کا پروردہ اور اسی کے بل پر قائم و موجود ہے، اس پر اپنی اتھارٹی کو محدود کر لینے اور اس سے بندگی کی چند رسمی باتیں قبول کر کے اسے خود مختار یا ہر ایک کی غلامی کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دینے پر راضی ہے۔

دین اور نبوت اور تقاضائے عبدیت کے یہ تصورات اگر صحیح نہیں ہیں اور فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا دین انسان کی ساری اجتماعی و انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور خدا کا مطالبہ اپنے بندوں سے یہی ہے کہ وہ ہر حیثیت سے اس کے قانون کے پیرو اور اس کی ہدایت کے متبع ہو کر رہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو اسی غرض سے بھیجا تھا کہ وہ اُس برحق نظامِ زندگی کو قائم کرنے کی دعوت دیں اور اسی کی اقامت کے لیے سعی کریں جو خدائے واحد کی اطاعت پر مبنی ہو تو کسی معقول آدمی کے لیے یہ تسلیم کرنا سخت مشکل ہے کہ سارے نبیوں میں سے تنہا ایک حضرت یوسف علیہ السلام ہی انوکھی قسم کے نبی تھے جن کے سپرد دین اللہ کو قائم کرنے کی سعی کے بجائے یہ خدمت کی گئی تھی کہ دین الملک کے تحت وزارتِ مال کی نوکری کریں اور نہ کوئی معقول آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تو عرب میں دینِ حق کی اقامت میں سعی وجہد بھی فرما رہے تھے اور دوسری طرف آپ کے نزدیک ایک غیر مسلم نظامِ حکومت بھی ایسا برحق تھا کہ ایک مسلم جماعت کے لیے وہ ایک مناسب جائے قیام ہو سکتا تھا۔ جو لوگ دین کو ایک معقول و مناسب نظام کی حیثیت سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو منتشر اور ایک دوسرے سے بے تعلق اجزاء کا مجموعہ سمجھتے ہیں ان کے لیے تو یہ بہت آسان ہے کہ انبیاء کے حالاتِ زندگی، قرآن کی تعلیمات اور دین کے احکام و اوامر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر ایک کی ایسی تاویلیں اور تفسیریں کریں جن سے ایک جزء دوسرے جزء سے اور ایک پہلو دوسرے پہلو سے صریح تناقض کا رنگ اختیار کرلے، لیکن اس دین کو ایک حکیم کے بنائے ہوئے مرتب و مربوط اور متناسب نظام کی حیثیت سے دیکھنے والوں کے لیے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اس دین کے ہر پہلو اور ہر جزء کی وہی تفسیر و تاویل اختیار کریں جو کلی نظام کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہو اور کسی ایسی تعبیر کو خواہ وہ کیسی ہی بڑے علماء کی طرف سے پیش کی گئی ہو، قبول نہ کریں، جس سے اس دین کے اندر تناقض اور اس کی تعلیمات اور انبیاء علیہم السلام کے کاموں کے درمیان تصادم لازم آتا ہو۔

اب ہم سورۂ یوسف کے زیرِ بحث مقامات اور ہجرت حبشہ کے واقعات سے براہِ راست بحث کریں گے۔

حضرت یوسف علیہم السلام کا قصہ جس طریقہ سے سورۂ یوسف میں بیان ہوا ہے، اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب قبل اس کے کہ نبوت سے سرفراز ہوتے، اپنے بھائیوں کی غداری اور ایک تجارتی قافلہ کی خیانت کی بدولت عزیزِ مصر کے مملوک ہو چکے تھے۔ اس مملوکیت کے زمانہ میں یا اس کے بعد جب کہ آپ قید کیے جا چکے تھے، آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کا منصب عطا کیا گیا اور اغلب یہی ہے کہ یہ سرفرازی قید ہی کے زمانہ میں ہوئی ہوگی، کیونکہ قید ہونے سے پہلے آپ کے کلام کا انداز پیغمبرانہ شان کا نہیں بلکہ صرف ایک مردِ صالح کا سا نظر آتا ہے۔ اس حالت میں جب آپ نبوت سے سرفراز ہوئے تو آپ نے معاً اپنی پیغمبرانہ دعوت کی ابتدا کر دی اور ساتھ کے قیدیوں ہی کو اُس چیز کی طرف بلانا شروع کر دیا جس کے لیے آپ مامور ہوئے تھے۔ اس دعوت کا خلاصہ سورۂ یوسف رکوع ۵ میں بیان ہوا ہے جس کا مطالعہ کر کے آج بھی ہر شخص یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان کا بلانا "اربابِ متفرقون" کی بندگی کی طرف نہیں تھا، بلکہ ایک رب کی بندگی کی طرف تھا اور وہ بار بار اہلِ مصر پر یہ واضح کرتے رہے تھے کہ جس بادشاہ کو تم نے رب بنا رکھا ہے وہ میرا رب نہیں ہے، بلکہ میرا رب اللہ ہے اور جس ملت کی میں پیروی کرتا ہوں وہ اللہ ہی کی بندگی سے عبارت ہے۔ یہ تبلیغ جو وہ قید خانہ میں کر رہے تھے، اس کے دوران میں یکایک یہ صورتِ حال پیش آئی کہ دیانت و تقویٰ

اور حکمت و بصیرت کے جو غیر معمولی نشانات ان کی ذات سے ظاہر ہوئے تھے، فرماں روائے مصر ان سے متاثر ہو گیا اور اس حد تک متاثر ہوا کر انھیں یہ توقع ہو گئی کہ اگر وہ سلطنت کے پورے اختیارات اس سے مانگیں تو وہ انھیں دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ اب یوسف علیہ السلام کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک راستہ یہ کہ وہ اسلامی انقلاب کے لیے دعوتِ عام، جد و جہد، کشمکش اور جنگ کے طویل عمل ہی کو اختیار کریں، جو عام حالات میں اختیار کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا راستہ یہ کہ وہ اس موقع کو جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ان کے ہاتھ آ گیا تھا، استعمال کریں اور عقیدت مند بادشاہ سے جو اختیارات مل رہے ہیں، انھیں لے کر ملک کے نظامِ فکر و اخلاق اور نظامِ تمدن و سیاست کو بدلنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ نے جو بصیرت ان کو عطا کی تھی اس کی بنا پر انھوں نے پہلے راستے کی بہ نسبت دوسرے راستے کو اپنے مقصد کے لیے مفید تر اور اپنی منزلِ مقصود سے قریب تر سمجھا اور اسے اختیار کر لیا۔ یہ غیر اسلامی نظام کی نوکری نہیں تھی جو پیٹ پالنے کے لیے یا ذاتی جاہ و منزلت کے لیے یا نظامِ فاسد کے اندر جزوی مصالح کے لیے کی گئی ہو، بلکہ یہ ایک تدبیر تھی جو اسی ایک مقصد کے لیے اختیار کی گئی تھی جس کے لیے تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت یوسف بھی مبعوث ہوئے تھے۔

جن لوگوں نے اسے محض نوکری سمجھا ہے اور یہ خیال کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے اس کو ذریعہ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس غرض کے لیے حاصل کیا تھا کہ کافرانہ نظام بدستور قائم رہے اور وہ اس کے تحت بس فائنس منسٹر کی خدمت انجام دیتے رہیں، ان کے نزدیک حضرت یوسف علیہ السلام کا مرتبہ موجودہ حکومتوں اور ریاستوں کے تنخواہ دار ملازموں سے کچھ بھی بلند نہیں ہے حتیٰ کہ اتنا بلند بھی نہیں جتنا ہمارے اس ملک میں کانگریسی وزارتوں کا مقام ثابت ہوا ہے جن کا طرزِ عمل تمام ملک دیکھ چکا ہے کہ جب تک انھیں اپنے مقصد (آزادیٔ ملک) کے لیے وزارت کے مفید ہونے کا یقین نہ ہو گیا، انھوں نے اور ان کے کسی چھوٹے بڑے شخص نے بھی وزارت قبول کرنے کا خیال تک نہ کیا اور پھر جب وزارتیں قبول کیں تو یہ دیکھ کر کہ فی الواقع جوہرِ اقتدار (Substance of power) ان کی طرف منتقل نہیں کیا گیا ہے، انھوں نے تمام وزارتوں کو لات مار دی۔

یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ اختیارات بادشاہ سے مانگے گئے تھے یا اس سے چھینے گئے تھے، اور نہ یہ بات کوئی اہمیت رکھتی ہے کہ حضرت یوسف کے برسرِ اقتدار آتے ہی بادشاہ معزول کر دیا گیا یا تختِ سلطنت پر قائم رہا۔ اصل اہمیت جو چیز رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو منصب طلب کیا تھا وہ آیا کافرانہ نظام کو چلانے کے لیے اور اس کی ملازمت قبول کرنے کی خاطر کیا تھا یا اپنے مقصدِ بعثت یعنی نظامِ اسلامی کو قائم کرنے کی خاطر؟ دوسری چیز جو اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ آیا فی الواقع ان کو ایسے اختیارات ملے تھے یا نہیں جن سے وہ ملک کے نظام میں تبدیلی کرنے کے قابل ہو سکتے؟ ہمارے نزدیک دین اور نبوت کے پورے تصور کا تقاضا یہ ہے کہ ہم حضرت یوسف کے مطالبہ "اجعلني على خزائن الأرض" کا مقصد نظامِ اسلامی کا قیام سمجھیں اور یہ سمجھیں کہ خزائن الارض کے مطالبہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا مدعا یہ تھا کہ ملک کے تمام ذرائع و وسائل (Resources) ان کے ہاتھ میں دے دیے جائیں۔ خان بہادر صاحب خواہ مخواہ خزائن کے لفظ کو مالیات کے معنی میں لے رہے ہیں، حالانکہ قرآن میں کہیں بھی یہ لفظ مالیات کے معنوں میں نہیں آیا ہے[1]۔ قرآنی آیات کا تتبع کرنے سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اس لفظ کا مفہوم وہی ہے جو "ذرائع و وسائل" کا مفہوم ہے اور ظاہر بات ہے کہ کسی شخص کے ہاتھ میں کسی ملک کے تمام ذرائع و وسائل کا ہونا اور اس کا ملک کے تمام سیاہ و سپید پر متصرف ہو جانا دونوں بالکل ہم معنی ہیں۔ اسی بات کی تصدیق توراۃ سے بھی ہوتی ہے جس میں بصراحت یہ بیان

[1] مثلاً آیت ولله خزائن السموات والأرض - وإن من شيء إلا عندنا خزائنه - أم عندهم خزائن ربك -

وقال الذين في النار لخزنة جهنم

ہوا ہے کہ فرعون مصر صرف برائے نام بادشاہ رہا ورنہ تمام ملک عملاً حضرت یوسف کے زیر نگیں ہو گیا۔[۵]

اب رہا یہ سوال کہ حضرت یوسف کے اقتدار حاصل کرنے کے بعد بھی ملک میں دین الملک برقرار رہا، جیسا کہ آیت "ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک" سے ظاہر ہوتا ہے، تو اس کے متعلق پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ عام طور پر اس کا جو ترجمہ کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مترجمین اس کا یہ مفہوم لیتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام دین الملک کے تحت اپنے بھائی کو نہیں پکڑ سکتے تھے، حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ یوسف کا یہ کام نہ تھا، یا یوسف کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ اپنے بھائی کو دین الملک کے تحت پکڑتا۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی اس محاورہ کا مفہوم عدم قدرت نہیں، بلکہ عدم موزونیت و عدم مناسبت ہی ہے۔ مثلاً ما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب (آل عمران، رکوع ۱۸) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تم کو غیب پر مطلع نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ تمھیں غیب پر مطلع کرے۔ اسی طرح ما کان اللہ لیضیع ایمانکم اور فما کان اللہ لیظلمھم اور ما کان اللہ لیذر المومنین علی ما انتم علیہ میں اللہ تعالیٰ کی عدم قدرت کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ یہ ذکر ہے کہ ظلم اور اضاعت ایمان اور مومنین و منافقین کو خلط ملط چھوڑ دینا اللہ تعالیٰ کا طریقہ نہیں ہے۔ اور خود سورۂ یوسف میں اس آیت سے پہلے ایک مقام پر جو ارشاد ہوا ہے ما کان لنا ان نشرک باللہ من شیٔ تو اس کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنے پر قادر نہیں ہیں، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ "ہم لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کریں"۔ پس آیت زیر بحث کو بھی یہ معنی پہنانا صحیح نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام دین الملک پر عمل کرنا چاہتے تھے مگر اس کے تحت اپنے بھائی کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے، بلکہ قرآنی استعمالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا صحیح مطلب یہی ہے کہ دین الملک کے تحت اپنے بھائی کو گرفتار کرنا یوسف علیہ السلام کے شایان شان نہیں تھا۔ البتہ اس آیت سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے صاحب اقتدار ہونے کے باوجود کم از کم فرعونی قانون تعزیرات سات آٹھ برس بعد تک (جب کہ حضرت یوسف کے بھائی وہاں پہنچے تھے) ملک میں نافذ تھا۔ لیکن اس کے متعلق اس سے پہلے بھی ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ ایک ملک کے نظام تمدن کو ایک رات کے اندر کلی طور پر تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور اسلامی انقلاب کا یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ اقتدار ہاتھ میں آتے ہی جاہلیت کے تمام قوانین و رسوم کو یک لخت بدل ڈالا جائے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ملک کے نظام تمدن کو کلی طور پر تبدیل کرنے میں پورے دس برس لگے تھے۔ لہٰذا اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے دور حکومت میں چند سال تک فرعونی قانونِ تعزیرات یا اس کے ساتھ کچھ دوسرے فرعونی قوانین بھی جاری رہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پیش نظر خدائی قوانین کا اجرا سرے سے تھا ہی نہیں اور وہ فرعونی قوانین ہی ملک میں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

---

[۵] سو فرعون نے اپنے خادموں سے کہا کہ کیا ہم کو ایسا آدمی ملے گا جس میں خدا کی روح ہے۔ مل سکتا ہے؟ اور فرعون نے یوسف سے کہا چونکہ خدا نے تجھے یہ سب کچھ بتا دیا ہے، اس لیے تیرے مانند دانش ور اور عقل مند کوئی نہیں۔ سو تو میرے گھر کا مختار ہو گا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا۔ اور اس نے اسے سارے ملک مصر کا حاکم بنا دیا اور فرعون نے یوسف سے کہا میں فرعون ہوں اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملک مصر میں اپنا ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پائے گا۔" (پیدائش باب ۴۱ آیت ۳۸ تا ۴۴۔)

خط کشیدہ فقرے صریح طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ فرعون حضرت یوسف علیہ السلام کا عقیدتمند ہو چکا تھا اور اگر اس نے آپ کی نبوت تسلیم نہیں کی تھی، تب بھی وہ پہلی ہی ملاقات میں ایمان لانے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پھر اس کے سات آٹھ برس بعد جب حضرت یوسف کے بھائی مصر پہنچتے ہیں تو حضرت یوسف ان سے کہتے ہیں

"پس تم نے نہیں، بلکہ خدا نے مجھے یہاں بھیجا اور اس نے مجھے گویا فرعون کا باپ اور اس کے سارے گھر کا حاکم بنا دیا۔ سو تم جلد میرے باپ کے پاس جا کر اس سے کہو تیرا بیٹا یوسف یوں کہتا ہے کہ خدا نے مجھے سارے ملک مصر کا مالک کر دیا ہے۔" (پیدائش، باب ۴۵ آیت ۸ تا ۹)

اب ہجرت حبشہ کے مسئلہ کو لیجیے۔ اس معاملہ کو جس انداز سے پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ حبش میں ایک غیر مسلم حکومت قائم تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو وہاں بھیج دیا تاکہ اس کی رعیت بن کر رہیں۔ پھر صحابہ کرام وہاں غیر مسلم بادشاہ کے وفادار بن کر رہے کیونکہ انھیں اس کے ماتحت عقیدے اور پوجا کی آزادی حاصل تھی، اور جب ایک ہمسایہ بادشاہ نے اس کے ملک پر حملہ کیا تو انھوں نے اس کی فتح یابی کے لیے دعائیں مانگیں۔ لیکن یہ واقعات کی بالکل غلط نقشہ کشی ہے۔ اول تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حبش بھیجا تھا اسی وقت آپ کو اس امر کا اندازہ تھا کہ نجاشی صالحین نصاریٰ میں سے ہے، چنانچہ حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ آپ نے مہاجرین سے اس کی مملکت کے متعلق فرمایا تھا وھی ارض صدق۔ دوسرے مہاجرین کو وہاں بھیجنے کی غرض یہ نہ تھی کہ وہاں کی رعایا بن کر رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کو ہجرت کا مشورہ دیتے وقت یہ فرمایا تھا کہ لو خرجتم الی ارض الحبشۃ حتی یجعل اللہ لکم فرجًا ومخرجًا "کاش تم لوگ حبش کی طرف چلے جاتے یہاں تک کہ اللہ تمھارے لیے کوئی صورت نکالے"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت پیش نظر صرف یہ چیز تھی کہ جو مسلمان کشمکش کے اس مرحلہ میں اپنی قوت برداشت سے زیادہ مصائب کے شکار ہو رہے تھے ان کو آپ نے عارضی طور پر ایک ایسی جگہ بھیج دیا جہاں اس قسم کے مصائب کی توقع نہ تھی اور مقصود یہ تھا کہ بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں تو یہ لوگ وہاں سے واپس آجائیں۔ اس کو نظیر بنا کر یہ نتیجہ نکالنا آخر کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اگر کسی غیر مسلم حکومت میں عقیدہ اور پوجا کی آزادی حاصل ہو تو یہ اس کے تحت ان کے وفادار رعیت بن کر رہ پڑنے کے لیے کافی ہے اور اس کے آگے کچھ اور مطلوب نہیں۔ پھر جب مہاجرین وہاں پہنچے اور کفار مکہ نے نجاشی سے ان کو واپس مانگنے کے لیے اپنا وفد روانہ کیا اور حضرت جعفر اور نجاشی کے درمیان مکالمہ ہوا تو محدثین اور اہل سیرت کی متعدد روایت کے مطابق نجاشی نے نہ صرف یہ کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق اس عقیدہ کی تصدیق کی جو قرآن میں بیان ہوا ہے، بلکہ مزید براں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بھی اقرار کیا۔ اس کے بعد نجاشی کے مسلمان ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ امام احمد نے عبداللہ ابن مسعود کے حوالہ سے (جو اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں) نجاشی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ اس نے کہا مرحبا بکم ولمن جئتم من عندہ اشھد انہ رسول اللہ وانہ الذی نجد فی الانجیل وانہ الرسول الذی بشر بہ عیسی ابن مریم۔ کیا یہ الفاظ کسی غیر مسلم کے ہو سکتے ہیں؟ اور بیہقی میں خود عمرو بن عاص سے جو مہاجرین کو واپس لانے کے لیے کفار مکہ کی طرف سے حبش بھیجے گئے تھے۔ یہ الفاظ مروی ہیں کہ انھوں نے اہل مکہ کو جو رپورٹ دی وہ یہ تھی کہ ان اصحمۃ یزعم ان صاحبکم نبی۔ کیا کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کر کے بھی غیر مسلم قرار پا سکتا ہے؟ ان روایات سے بڑھ کر معتبر و مستند روایت یہ ہے جو بخاری و مسلم میں ملتی ہے کہ اس شخص کی وفات کی خبر پا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی اور فرمایا مات الیوم رجل صالح فقوموا فصلوا علی اخیکم اصحمۃ "آج ایک مرد صالح نے وفات پائی ہے، اٹھو اور اپنے بھائی اصحمہ کی نماز جنازہ پڑھو"۔ اس کے بعد تو سرے سے اس استدلال کی بنا ہی منہدم ہو جاتی ہے جو ہجرت حبشہ کے واقعہ سے کیا جاتا ہے۔

خان بہادر صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں جماعت اسلامی اور اس کی دعوت اور اس کے کام پر جو اعتراضات فرمائے ہیں ان کے جواب میں کچھ کہنے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ ان باتوں کو اس سے پہلے وہ سیاسی کشمکش حصہ سوم کی تنقید میں بیان فرما چکے ہیں اور ان کا جواب بھی میں اس تنقید کے جواب میں عرض کر چکا ہوں (ترجمان القرآن بابت [illegible]) لیکن آج

وہ ان ساری باتوں کو پھر اس طرح دوہرا رہے ہیں کہ گویا کبھی ان کا جواب دیا ہی نہیں گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے طرز فکر سے ان کا اور ان کی طرح سوچنے والے لوگوں کا طرز فکر بالکل مختلف ہے اور ہماری بات ان کی سمجھ میں اسی طرح نہیں آسکتی جس طرح ان کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ جن سوالات کو وہ اہمیت دے کر بار بار ہمارے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارے نزدیک اصل سوالات وہ نہیں ہیں، بلکہ بنیادی سوال صرف یہ ہے کہ دین اسلام کا اصل مطالبہ اپنے پیروؤں سے کیا ہے اور امت مسلمہ کا حقیقی مشن کیا ہے جس کی خاطر اس کو ایک مستقل امت بنایا گیا ہے۔ جب تک اس مسئلہ میں ہمارے اور ان کے نقطۂ نظر کا اختلاف باقی ہے اس وقت تک ناگزیر ہے کہ راہ عمل کے ہر قدم میں وہ ہمارے اور ہم ان کے مخالف رہیں اور ہمارا ہر عمل ان کے نزدیک بے عملی اور ان کا ہر عمل ہمارے نزدیک بے عملی یا بدعملی رہے۔ پس فروع اور شاخوں پر ہم سے جھگڑنے میں وہ خواہ مخواہ اپنا اور ہمارا اور ہمارے ناظرین کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ان کو پہلے اصول سے بحث کرنی چاہیے اور جب اصول پر وہ اور ہم متفق ہو جائیں تب کہیں ہمارے اور ان کے درمیان یہ بات زیر بحث آسکتی ہے کہ امت مسلمہ کے حقیقی مشن کو پورا کرنے کے لیے وہ طریقہ کتاب و سنت کے مطابق ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے یا وہ طریقہ جس پر خان بہادر صاحب اور ان کے طرز فکر کے لوگ اب تک کاربند رہے ہیں۔

ایک ضروری گذارش

مرکز جماعت اسلامی سے خط و کتابت کرتے ہوئے ارکان جماعت اور دوسرے کرم فرما از راہ عنایت حسب ذیل امور کا لحاظ رکھیں:

(۱) اپنے ہر خط میں لازماً پورا پتہ نہایت صاف لکھیے۔

(۲) مرکز کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے امور کو یکجا لکھنے کے بجائے علیحدہ علیحدہ سلپوں پر لکھیے اور ہر سلپ پر پورا پتہ درج کیجیے ورنہ نہ صرف یہ کہ تعمیل میں دیر ہوگی اور ہمارا وقت ضائع ہوگا بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ خط کے بعض حصوں کی تعمیل سرے سے ہو ہی نہیں۔

(۳) اپنے مدعا کو کم سے کم الفاظ میں بالکل سادہ طریقہ سے تحریر فرمائیے۔ طویل عبارت آرائی کی وجہ سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ خود آپ ہی کا نقصان ہے۔

نوٹ:۔ مرکز کے مختلف شعبوں کے دائرۂ کار کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ شعبۂ استفسارات، علمی، دینی، فقہی مسائل کے علاوہ تحریک اسلامی کے متعلق اصولی مسائل کا جواب دیتا ہے۔

(۲) شعبۂ تنظیم جماعت اسلامی، جماعت کے دستور، شرائط رکنیت، شمولیت جماعت، رفتار کار، رفتار تنظیم وغیرہ امور کے متعلق معلومات فراہم کرے گا۔ نیز اراکین اور مقامی جماعتوں کے لیے کام کا پروگرام متعین کرنا، ان کی رپورٹیں جمع کرکے ہدایات دینا اور اجتماعات کے متعلق جملہ امور طے کرنا اسی شعبہ کا کام ہے۔

(۳) مکتبہ جماعت اسلامی، جماعتی لٹریچر کی اشاعت کا کام کرتا ہے۔ کتابوں کے آرڈر مکتبہ ہی کے نام آنے چاہئیں، نیز جماعت کے بورے اشاعتی کام کے متعلق اسی دفتر کو مخاطب کیا جائے۔

۴۔ دفتر ترجمان القرآن کو صرف رسالہ سے تعلق رکھنے والے امور کے لیے مخاطب کیا جائے۔